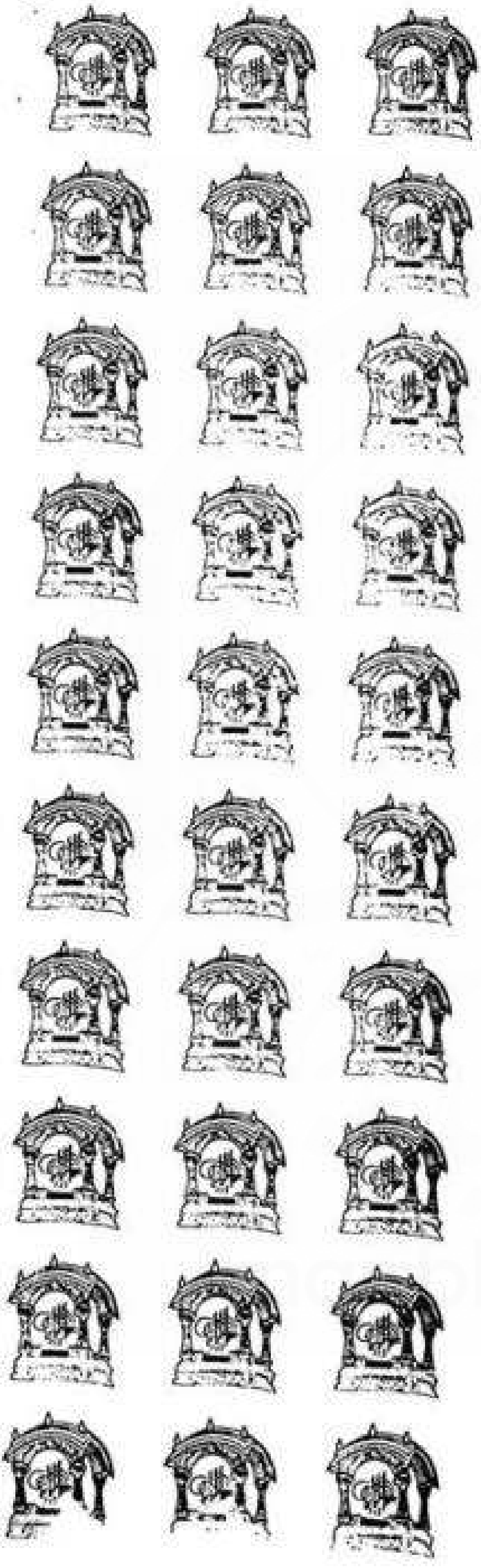
آزادی کے بعد دہلی میں

اردو نظم

مرتبہ:

ڈاکٹر عتیق اللہ

اردو اکادمی، دہلی



آزادی کے بعد دھلی میں

اردو نظم

maablib.org

آزادی کے بعد دھلی میں

اردو نظم

مرتب

پروفیسر عتیق اللہ

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۴۷

AZADI KE BAD DELHI MEIN
URDU NAZM

Edited by
Prof. Ateequllah

Pub.by
URDU ACADEMY, DELHI

Prints
1990,1992, 2001, 2011
Rs.[redacted]

ضابطہ

سنینِ اشاعت

۱۹۹۰، ۱۹۹۲، ۲۰۰۱، ۲۰۱۱ء

پچھتّر روپے

اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-049-X

ترتیب

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستورالعمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِاعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو

اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اس کتاب میں آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے مرتب پروفیسر عتیق اللہ نے بڑی جانفشانی اور باریک بینی سے یہ کام کیا ہے اور اس پر فاضلانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جاتی رہے گی۔

انیس اعظمی
سکریٹری

مقدمہ

دہلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب، اپنا ایک عظیم ماضی رکھتا ہے۔ ماضی جس کی جڑیں دُور بہت دور تک چلی گئی ہیں۔ گہری اور گہری جس کی تاریخ پورے ہندوستان کی تاریخ ہے۔ حیرت خیز حرکت سے معمور، زندگی سے بھری پُری، متنوع اور مسلسل جو ہندوستان کی کشادہ ترپیشانی کا انتخاب مثالِ تاج بھی ہے اور زخموں سے چور مگر متواتر دھڑکتا ہوا دل بھی۔ جس نے اَن گنت فلک شکار علم بلند ہوتے ہوئے دیکھے اور اُن شہاں کی آنکھوں میں پھرتی ہوئی سلائیاں بھی، جن کی خاکِ پا اپنی تاثیر میں کحل جواہر سے کم نہ تھی۔ عروج کے پہلو میں زوال، شکست کے عقب ہی میں فتح اور فتح کی معیت ہی میں شکست کا نظارہ کیا۔ شمشیر وسناں اول و طاؤس رباب آخر اور طاؤس و رباب اول و شمشیر و سناں آخر کی مثال بھی یہی شہر ہے۔ مردم خیز ہے اور شہیدانِ لالہ گوں کے خون سے تر بتر سرزمینِ کرب و بلا بھی یہی۔ اس کا ایک ایک نقش عجیب و نادر ہزاروں ہزار داستانیں لبِ خاموش سے ادا کرتا ہے۔ اپنے فن میں اکمل، جلال و جمال کا نمونہ مثبت و مستحکم، لازوال ولافانی، بسانِ تعبیرِ خواب، خیال کی انتہاؤں کی شان۔ اس کے نغمات کا جادو بھی الگ، اس کی فغاں کا طرز بھی جدا۔

ہاں تو یہی ہے وہ عظیم الشان دیارِ پُر فنگار جو اپنے زخم زخم پیکر میں تاخت و تاراج کے کئی لہو رنگ ابواب چھپائے ہوئے ہے اور یہی وہ دیارِ فکر و فن ہے جو گہوارۂ علم و ادب بھی ہے، تربیت گاہِ کلمہ و کلام بھی۔ اس کے سخن پورے ہندوستان کے بول ہیں اور پورے ہندوستان کی اگر کوئی زبان ہے تو یہی زبانِ دہلوی، اُردوئے معلّیٰ۔ امیر خسرو کی منھ لگی،

آبرو و حاتم کا محاورہ، میر و غالب کا چلن، خواص کا تکلف، عوام کا روزمرہ۔

دہلی ایک ادبی مرکز ہی نہیں ہے مراکز کا مرکز ہے، محوروں کا محور، علم و ادب کا لازوال سرچشمہ، ایک ادارہ، ایک دبستان، ایک تحریک۔ وہ طوائف الملوکی کا دور ہو کہ سقوط و زوال کا تاثیر، دہلی کے سخن پردازوں نے اپنی روایات و اقدار کا بہر صورت تحفظ کیا۔ دہلی کی شاعری پورے ہندوستان کی شاعری کے رجحانات کی آئینہ دار، نیز آغاز و ارتقاء کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔

ایک عظیم ادبی مرکز ہونے کے ناطے یہاں دوسرے علاقوں سے سخن پرداز ہی نہیں آتے رہے، یہاں کے نمائندہ اساتذۂ کرام کا رُخ دوسرے مراکز کی طرف بھی رہا۔ اس طرح ایک مرکز دوسرے مرکز پر محسوس و غیر محسوس طور پر اثر انداز بھی ہوتا رہا اور ایک دوسرے کے مایۂ فکر کو متموّل اور تونگر بھی کرتا رہا۔

ملکی سطح پر رسل و رسائل کے ذرائع کی ترقی کے بعد باہمی خلط و ربط کو زیادہ فروغ ملا۔ نقل کی رفتار آزادی سے قبل ہی تیز ہو گئی تھی۔ آزادی کے بعد زمینداری کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا، صنعتی ارتقاء نے شہروں کو وسیع تر کر دیا، تعلیم یافتہ نوجوان روزگار کی تلاش میں شہر شہر بھٹکنے لگے۔ بڑے شہروں کی ملازمتوں نے پرانے رشتوں کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ اب دہلی اور وہ بھی آزادی کے بعد کا دہلی انیسویں صدی کے نصف اول کے دہلی سے کوسوں دور ہو گیا تھا۔ یہ بُعد نشست و برخاست کے طریقوں، زبان و بیان کے شعائر اور رد و قبول کی ترجیحات سے قطعاً نمایاں ہے۔ محاورے بدل گئے۔ اکتساب و تحصیل کے صیغے تبدیل ہو گئے۔ شعر سے تغزل کی آب اڑ گئی۔ جذبے کی تڑپ ہو کہ سوزِ دروں، چھاتی کا پھٹنا ہو یا داغِ دل کی چمک، خاک و خون میں لتھڑنا ہو کہ ان گلیوں میں جا میں کھپا دینے کا روزمرہ جو اوراقِ مصور سے مماثل تھیں اور جو آباد تھیں ان جیالوں سے جو سرتاپا تصویر تھے۔ بعد از آزادی غزل کے خصوص میں ان آثار کی محض رمق تو موجود ہے مگر تسلسل کی تواتر سے یہ صنفِ کم آمیز دو چند دور ہو گئی جب غزل کا یہ عالم ہے تو نظم کی صورت کیا ہو گی، اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر انتخاب دہلی میں جدید اردو نظم کے محض اس دور کو مختص ہے جس کا آغاز

اُس صبحِ آزادی سے ہوتا ہے جو شب گزیدہ تھی اور جس کے اُجالے داغ داغ تھے۔

انتخاب کے دوران درج ذیل تین واضح حدود کا لحاظ رکھا گیا ہے جو شرائط بھی ہیں، دائرہ ہائے کار بھی۔

(ا) جغرافیائی لحاظ سے ایک مخصوص شہر یعنی دہلی جس کا ایک ذخار ادبی ماضی ہے اور جو خود بعض ادیبوں کی نظر میں ایک دبستان کا حکم رکھتا ہے۔

(ب) دہلی کے وہ شعراء جو نظم سے ایک ربطِ خاص رکھتے ہیں یا نظم کے میدان میں جن کی انفرادیت مسلّم ہے۔

(ج) زبان کے اعتبار سے وہ نظم گو شعراء جو خواہ آزادی سے قبل سے لکھتے آ رہے ہوں، آزادی کے بعد بھی جنھوں نے اپنی تخلیقی سرگرمی کو برقرار رکھا ہے۔

دہلی میں آزادی سے قبل اور فوری بعد کے وہ شعراء جنھیں میمنہ سے غرض تھی نہ میسرہ سے۔ جو اصلاً استاد تھے۔ ان میں بیشتر غزل کے شاعر تھے کہ غزل کا میدان قافیہ پیمائی اور مشقِ سخن کے لیے بڑا کشادہ ہے مگر اس کا کیا کیجیے کہ نظم کا طوطی بول رہا تھا۔ اب جو نظم نہ کہے بے اوقات ٹھہرے۔ اساتذۂ فن نے اپنی سخن سازی کے جوہر ادھر بھی دکھائے۔ موضوعات کی کمی نہ تھی۔ قومی اور وطنی مسائل کے پہاڑ سر بہ فلک کھڑے ہوئے تھے۔ مسدس، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنوی اور قصیدے وغیرہ کی ہیئتیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ قافیہ پیمائی کا سکہ یہاں بھی خوب چلا۔ کسی نے سیاسی خیالات و واقعات کو منظوم کرنے پر اکتفا کی اور کوئی محض گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور ابو الکلام آزاد وغیرہ کی مدح و تحسین میں اپنے آپ کو صرف کرتا رہا۔ چونکہ دہلی ہندوستان کا دل اور قومی سیاست کا مرکز تھا اس لیے یہاں کی بیشتر نظموں کا محور سیاست تھا اور لہجے میں خطابت تھی۔ آہنگ میں بلندی۔ یہ نظمیں عام ترقی پسند شعراء کی نظموں سے قدرے مختلف تھیں کہ ان میں تکرار اور وقتی پن زیادہ نمایاں تھا۔ ان کی اصل شبلی، ظفر علی خاں اور چکبست کی زمینوں میں پیوست تھی۔ کہیں کہیں اختر شیرانی اور جوش کی رومانی شاعری کے آثار بھی ان میں نمایاں ہیں۔ چوتھے اور پانچویں دہے میں دہلی میں جوش خود ایک انجمن کا حکم رکھتے تھے۔

جوشؔ کی شاعری ایک طرف ترقی پسند شعراء پر اثرانداز ہوئی تو دوسری طرف ان استاد شعراء کے لیے اس شاعری میں خاصا مایہ و ساز موجود تھا جو نظم کرنے کے فن سے تو آگاہ تھے تخلیق کے ہنر سے بے بہرہ۔ ایک عمومی خیال یا تجربے کو میکانکی پیرایے میں ادا کر دینا ہی ان کے لیے کافی تھا۔

موضوعاتی نظم لکھنے والے شعراء اپنے زمانے میں انتہائی مقبول ہوئے بالخصوص دہلی میں اردو نظم کے کسی بھی انتخاب میں انھیں شامل نہ کرنا ان کے ساتھ ہی نہیں ادب کی تاریخ کے ساتھ بھی ناانصافی ہوگی۔ ان بزرگ شعراء کی مشمولہ نظمیں ان کے فن اور فکر کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔

شعری اصناف میں نظم کی صنف انیسویں صدی کے آخری دہوں میں متشکل ہوتی ہے۔ اقبالؔ اور پھر اقبال کے بعد ترقی پسند تحریک کے ذریعے اس کے خدوخال متعین ہوتے ہیں۔ یہاں تعین کا لفظ بھی زائد ہے کہ افسانہ کی طرح نظم بھی ایک بے حد سیال صنفِ سخن ہے۔ نظم چونکہ نسبتاً ایک نئی صنف ہے اس لیے اس خصوص میں دہلی کی معروف لسانی اور اسلوبی خصوصیات کی تلاش بے محل ہوگی۔ دراصل نظم کو اپنا صحیح تخلیقی پیکر عطا کرنے کا سہرا ان شاعروں کے سر ہے جو اردو کے مقبولِ عام لسانی اور تہذیبی مراکز سے دور تھے ان مراکز میں روایت کا پاس رکھنا عقیدے کے مترادف تھا۔ نظم اور وہ بھی نظم کا نیا تصور ہماری ادبی روایات کا زائیدہ نہ تھا۔ سو اس کا رنگ ان زمینوں میں بڑی فراخی کے ساتھ پھوٹا۔ جہاں روایت کی فہم تو تھی آسیب نہ تھا۔

دہلی میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ان نظم گو شعراء کی تعداد زیادہ ہے جنھوں نے ملک کے مختلف صوبوں سے آ کر یہاں سکونت اختیار کر لی تھی ان میں بھی بیشتر وہ ہیں جنھوں نے تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان کو خیرباد کہا اور دہلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ چوتھے اور پانچویں دہے میں دہلی نظم گو شعراء کا مرکز بن گیا تھا۔ اب یہ شہر جہان آباد کے گلی کوچوں سے نکل کر چاروں دھام پھیل گیا تھا۔ زبانوں پر میرؔ و غالبؔ یا مومنؔ و ذوقؔ کا کلمہ نہ تھا۔ بلبلِ ہند۔ فصیح الملک نواب مرزا داغؔ دہلوی اور ان کے لائق و فائق تلامذہ کا

فرمایا ہوا اسناد کا درجہ رکھتا تھا۔ سائل دہلوی، آغا شاعر قزلباش، زار دہلوی، بیخود دہلوی اور ان کے طرح دار شاگرد داستادرسا دہلوی وغیرہ کی صحبتیں ابھی یادداشتوں میں تازہ اور محفوظ تھیں۔ اب بھی کبھی کبھی کسی گلی کے نکڑ پر یا کسی قہوہ خانے کے نیم روشن گوشے میں زبان وبیان محاورہ اور روزمرہ کی صحت وسند جیسے مسائل پر مناظرے ومناقشے جیسی صورت دکھائی پڑجاتی ہے۔ اور گھوم پھر کر غزل اور اس کے اشعار ہی حوالوں کا ماخذ ثابت ہوتے ہیں۔

ان حالات میں نظم ان ذہنوں کو زیادہ راس آئی جو استاد وشاگردی کے جھمیلے میں نہ پڑے۔ ان میں بیشتر حضرات وہ تھے جو نئی تعلیم سے بہرہ ور تھے اور جنھوں نے ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں عارضی یا مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔

اردو شاعری میں آزادی سے قبل ہی زبردست تبدیلیاں واقع ہوچکی تھیں۔ ترقی پسند تحریک اور پھر حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے فکر اور فن کے کرے کو وسعت بخشی اور ہمارے ذہنی انجماد پر مہمیز کا کام کیا۔

ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک تھی مگر اس کے سلسلے سیاست سے بھی ملتے تھے۔ ترقی پسند شعراء نے پہلی بار سیاسی نظم کے تصور کو فروغ دیا۔ اس تحریک سے قبل وطنی اور قومی نظموں کا رواج تھا جو اپنی فکر اور موضوع کے لحاظ سے محدود کینوس رکھتی تھیں۔ ترقی پسند شعراء نے نئی دانش سے رشتہ استوار کیا۔ موضوع سے زیادہ قدر اور نظریے کو اہمیت تفویض کی اور اس طرح پہلی بار نظریاتی شاعری کے تصور نے ہمارے یہاں بار پایا۔ اس سوال سے قطع نظر کہ مجموعاً ترقی پسند شاعری کے سرمائے میں سے کس قدر زندہ اور آج بھی بامعنی ہے۔ من حیث المجموع ترقی پسند تحریک نے ہماری ادبی تاریخ کو ایک وسیع تناظر عطا کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ابھی تک ہماری نظم چند مخصوص اور محدود موضوعات ومسائل کے اظہار پر ہی قانع تھی۔ ترقی پسند شاعری نے باہمی بشری وابستگی کے تصور کو فروغ دیا کہ انسانی سطح پر تمام عالم ایک عظیم برادری سے مماثل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند شاعروں کے یہاں بین الاقوامی مسائل کا ادراک اور فرسودہ اقدار وتصورات نیز بشریت کش نظامات سے بیزاری نمایاں ہے۔ انھوں نے چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے اس اسلوب کو فروغ دیا جسے عرفِ عام میں

حقیقت پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لفظ کو احتجاج اور بغاوت کا درس دیا اور طنز کے ان اسالیب کی راہ پھر سے روشن کی جو سودا کے بعد درمیان ہی میں ظلمت کا شکار ہو گئے تھے۔ پرانے بھرم ٹوٹے اور نئی دنیا کے خواب دکھائے گئے۔ ترقی پسندوں کے معنی واضح ہیں اور اپنا محل رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے درمیانی دہائیوں میں باہر کے جس تصادم سے انسان دوچار تھا ترقی پسند شاعری اس کا فطری اور حقیقی اظہار ہے۔

ترقی پسند شاعری کا ایک بڑا حصہ اپنے زمان سے وابستگی کے باعث بے مصرف ہے لیکن پیش رو نسلوں کی ذہنی آبیاری میں اس نے اہم حصہ لیا ہے۔ روایت شکنی کا حوصلہ ہمیں اسی تحریک سے ملا۔

ترقی پسند تحریک کے پہلو بہ پہلو حلقۂ ارباب ذوق (۱۹۳۸ء) کی تحریک بھی جاری تھی۔ ترقی پسندوں کا رُخ اگر خارج کی طرف تھا تو حلقہ کا سارا زور داخل پر تھا۔ ہیئتی و لسانی سطح پر حلقے کے شعرا انحراف کی طرف مائل تھے۔ انھیں ان خارجی مسائل سے کوئی سروکار نہ تھا جن میں بھوک، افلاس، استحصال، محکومی، نابرابری، جہالت اور پسماندگی وغیرہ اہلِ ایشیا کی تقدیر تھے۔ حلقے کے نزدیک ادب علاج الغربا ہے نہ ان مسائل کا حل ادب کی توفیق میں ہے۔ میراجی حلقے کا ذہن تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ اس حقیقی شاعری کو رواج دینا چاہتے تھے جس میں فرد کی نفسی بے چینی، روحانی اضمحلال اور جنسی محرومی جیسے موضوعات کے لیے بھی جگہ ہو۔ گویا اردو شاعری کو وہ ایک نئی اخلاقیات سے ہمکنار کر رہے تھے۔ بے خوفی جس کا کردار ہو اور آزادہ روی جس کی شریعت۔ میراجی نے نظم کو شعر کی سطح پر لانے کی مساعی کیں کہ شعر کا وہ داخلی ارتکاز جس میں معنی کی قدر اپنی اضافیت کے باعث قاری کی حسِ تخلیق کو حرکت میں لے آتی ہے، ہماری نظم میں مفقود تھا۔ چیزیں اتنی واضح نہیں ہوتیں جتنی کہ بادی النظر میں دکھائی دیتی ہیں اور حقیقت سے پرے بھی حقائق کا ایک ناپیدا کنار سلسلہ ہے، نگاہ سے بعید، دست و رسا سے باہر۔ شاعری شعور سے زیادہ خواب کا عمل ہے یا فرائڈ کے لفظوں میں دن کا خواب ہے۔ میراجی کے کلام میں اِسی نوع کی خواب سازی، سرسراتی ہوئی مبہم کیفیت، داخلی کلامی اور نرم روی برقرار ہے۔ ان کی نظموں سے موضوع یا ان کا ذاتی تجربہ آہستہ آہستہ

نمایاں ہوتا ہے کہ زبان جب نا راست طریقے سے استعمال کی جاتی ہے تو اس میں تخصیص کا پہلو ابھرتا ہے۔ یہ ہنر لفظوں کو تخلیقی طور پر برتنے سے عبارت ہے۔ میرا جی کی شاعری شعری زبان کا نیا تجربہ اور تخلیق کی گمشدہ کڑیوں کی از سر نو دریافت سے مماثل ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ میرا جی کی نظموں کا ابہام ان کی ناراست اور تخلیقی زبان نیز ادائیگی کے نئے طریقوں پر منتج ہے۔ عام طور پر انھیں علامتی شاعر کے نام سے پکارا جاتا ہے جبکہ علامتوں کا استعمال ان کے یہاں کم سے کم ملتا ہے۔ نظم آزاد کی تکنیک اس دور کا نیا تجربہ تھی اور پھر نظم میں تلازمہ بہ تلازمہ خیال کا ارتقار پایا جاتا ہے۔ اس طور پر درمیان میں کئی ایسے وقفے اور تعطلات بھی بار پا جاتے ہیں جنھیں زود حس قاری فوراً اخذ کر لیتا ہے مگر سرسری مطالعے میں وہ گرفت میں نہیں آتے۔ اس معنی میں زبان ہیئت اور تکنیک کا یہ نیا تجربہ ہمارے لیے نامانوس مگر مغرب میں مروج تھا۔ میرا جی کی شاعری میں جو مابعد الطبیعیاتی دھند اور سرّیت ترشح ہے۔ اس کی جڑیں ایک طرف راں بو اور میلارمے کے تخلیقی تجربوں میں اور دوسری طرف خود مشرق کی صوفیانہ شاعری کی روایت میں پیوست تھیں۔ میرا جی نے خالص شاعری کی تلاش میں کلاسیک کو بھی از سر نو دریافت کرنے کی جستجو کی تھی۔

ضیاء جالندھری، مختار صدیقی، قیوم نظر اور یوسف ظفر وغیرہ بھی حلقے کے سرگرم رکن اور تجربہ پسند شعراء تھے۔ ان سب پر میرا جی کی فکر اور فن کا گہرا اثر تھا۔ مختار صدیقی نے موسیقی کے راگوں اور بولوں کی فضا کے بنیادی تاثر یا کیفیت سے احساس رشتہ قائم کر کے تکنیک کے بعض بڑے انوکھے اور خلاقانہ تجربے بھی کیے ہیں۔ دیگر شعراء میں حسِ شعر کا فقدان تھا۔ ان کی نظموں میں ذہنی پسپائی، اوپر سے عاید کردہ حبس مایوسی اور ناکامی جو فرسودہ تہذیبی اقدار کے زبردست دباؤ پر منتج ہے یا روحانی اور مابعد الطبیعیاتی جلاوطنی جیسی کیفیت ان شعرا کے تجربوں پر مستولی ہے۔ جو نتیجہ ہے روحانیت کش مشینی تہذیب کا۔ پھر یہ کہ خالی خولی ہیئت پرستی ان کی ترجیحات میں اوّل تھی۔ ن۔م۔ راشد حلقے کے تمام شعراء سے علاحدہ اپنا ایک تخلیقی کرہ رکھتے ہیں۔ میرا جی اور ان کے حلقے کے شعرا کے احتجاج کی دھیمی لے راشد کے یہاں ستیزہ کاری میں بدل جاتی ہے۔ راشد کا غم و غصہ ترقی پسندوں

سے مماثل ہے۔ مگر ان کی نظموں کی تکنیک کا کمال ہے کہ برافروختگی کی کیفیت مسلسل قائم نہیں رہتی۔ بالخصوص بعد کی نظموں میں دانش کا عمل بھی پہلو بہ پہلو جاری ہے۔ اس باعث بھی غم و غصہ کی فضا میں وہ شدت پیدا نہیں ہوتی جو نظم کی بنیادی حس اور تخلیقی تاثر کو مجروح کر سکے۔ راشد کی نظم جدید انسان کی داخلی فلسفیانہ بے چینیوں، بشری اقدار کی پامالی، سیاسی اور سماجی کرب کی مظہر اور ایک مسلسل احساسِ زیاں کا حوالہ ہے۔ جدید شعراء پر فیض کے علاوہ میراجی اور ن۔م۔ راشد کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات ہیں۔

دہلی میں آزادی کے پس قریب کے شعراء پر انھیں ہر دو تحریکات کا اثر غالب تھا۔ ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں کے مراکز میں دہلی کے علاوہ علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ، بمبئی، حیدرآباد اور بھوپال پیش پیش تھے۔ سیاسی، تہذیبی اور جغرافیائی رابطے کے لحاظ سے دہلی اور لاہور کے درمیان ایک سے زیادہ قدر مشترک تھی۔ نیا ادب، شاہراہ، افکار اور سویرا جیسے رسائل ترقی پسند تحریک کے زبردست ترجمان تھے جبکہ بہترین ادب، سال بہ سال انتخابات اور ادبی دنیا، نئی تحریریں (لاہور) حلقۂ ارباب ذوق کی تخلیقی سرگرمیوں کو مخصوص تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آزادی سے قبل اور کچھ بعد بھی ان رسائل و کتب میں شمولیت کے لیے ناموں اور کاموں کی کسی خاص تخصیص کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ جوش جیسے شاعر حلقے کی کتابوں میں شامل تھے۔ ترقی پسند رسائل میں بھی ابتداً کسی خاص حد کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی سے فوری قبل پروان چڑھنے والے بعض شعراء کے یہاں اسلوب کے اس رویے نے بڑا خوشگوار نقش قائم کیا ہے۔ جس میں موضوع اور ہیئت کی علاحدہ تخصیص نہیں کی گئی تھی۔ تخلیقی وحدت کے حق میں اس نوع کی تخصیصات حشو کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان شعراء نے سیاسی و سماجی شعور کا اظہار تو کیا مگر جمالیاتی اور فنی ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اپنی بہترین مثالوں میں اختر الایمان، مجید امجد، مخمور جالندھری، منیب الرحمن اور سلام مچھلی شہری کی نظمیں اسی تخلیقی انضمام سے عبارت ہیں۔

دہلی آزادی سے فوری قبل ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پورے غیر منقسم ہندوستان کی نظریں دہلی کی سیاسی، تہذیبی اور ادبی نشیب و فراز پر لگی رہتی تھیں

بزرگ شعرا، سیاسی رہنماؤں اور سیاسی مدوجزر کے کل وقتی ترجمان تھے۔ نوجوانوں میں بیشتر وہ تھے جو فرسودہ سیاسی نظامات اور فرقہ وارانہ جماعتی دھڑوں سے بدظن تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں ملک دیوالیہ ہو چکا تھا، بیروزگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، لسانی، علاقائی اور مذہبی تنازعات اپنے عروج پر تھے اس پر تقسیم وطن کا خوف۔ ترقی پسند شعراء نے فرسودہ اقدار کو بدلنے کا نعرہ بلند کیا، نئے سماج کی تعمیر کا خواب دکھایا۔ دیر قامت مسائل کے حل بتلائے۔ یہ لے وہ تھی جو اونچی اور بڑی مرعوب کن تھی۔ عوام نے اس شاعری کا پُر زور خیر مقدم کیا۔ اُردو میں پہلی بار شاعر اور سامع کا رشتہ ترقی پسند تحریک ہی کے ذریعے مضبوط ہوا۔ مگر ان نوجوانوں کا کیا کیجیے جو ارباب حل وعقد کے مکروبے مہریوں سے نالاں تھے۔ نالاں تو سب ہی تھے مگر ترقی پسندوں نے ایقان و رجا کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

پانچویں دہے میں ضیاء جالندھری، مختار صدیقی، اختر ہوشیار پوری، اعجاز بٹالوی، تاجور سامری اور پھر مخمور جالندھری اور افسر آذری جیسے جوان العمر شعراء نے دہلی کی شعروسخن کی محفلوں کو بڑی رونق بخشی۔ یہ شعراء ابتداء میں انضمام ہی پر کاربند تھے۔ جنگ، امن، انسان دوستی، جذباتی درشتی، رومان و حقیقت کی کش مکش، جنسی و نفسیاتی کشاکش اور ایک مسلسل ناآہنگی جیسے داخلی اور خارجی مسائل و موضوعات پر ان کی بیشتر نظمیں استوار تھیں۔ مجموعاً ان شعراء کا رویہ رومانی و نیم رومانی اور کہیں کہیں مخالف رومانی ہے۔ خارج و داخل کی ناآہنگی نے ان کے یہاں جس افسردگی اور ذہنی جلاوطنی کے تاثر کو اُبھارا ہے۔ وہ ان کے رومانی ذہن کی دلیل ہے۔ اپنے عہد سے عدم مفاہمانہ رویہ، تلخ آمیز انداز گفتار اور داخلیت کوشی کے علاوہ اظہار کے طریقوں میں نئے پن کی جستجو ان کی نئی خود شعوریت کی غماز ہے۔ ضیاء جالندھری (۱۹۲۳ء) جو آزادی سے قبل آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک تھے، میراجی کی طرح نظم میں رواں بحروں کے استعمال میں چابک دست تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ خیال کے اعتبار سے بوجھل چیزوں کو افعل گردانتے ہیں۔ مگر ضیاء نے لمسی اور بصری پیکروں کا استعمال اس خلاقی کے ساتھ کیا کہ خیال کا بوجھل پن جاتا رہا۔ ضیاء جالندھری کی پیکر سازی میں نیا پن تھا، یہی چیز انھیں حلقے کے دیگر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ مختار صدیقی (۱۹۱۹ء) بھی آزادی سے قبل

آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈرامہ لکھنے پر مامور تھے۔ موسیقی سے فطری شغف تھا اور ریڈیائی ڈرامہ سازی ان کا پیشہ۔ ان ہر دو فن نے ان کی تجربہ پسندی پر مہمیز کا کام کیا۔ ہیئت کے باب میں ان کے تجربات انوکھے اور رنگا رنگ ہیں۔ بعد ازاں کمال احمد صدیقی اور رفعت سروش نے اس خصوص میں بعض قابلِ قدر اضافے کیے کہ یہ دونوں موخرالذکر فنکار بھی آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک رہے۔ موسیقی اور منظوم ڈرامے سے بھی ان کو خاصا شغف تھا۔ اختر ہوشیار پوری (۱۹۱۸ء) اس دوران میں کوئی گہرا نقش قائم نہیں کر پائے مگر اعجاز بٹالوی (۱۹۲۳ء) بڑے ذہین اور طباع تھے۔ لاہور میں حلقے کے سرگرم رکن تھے۔ میرا جی سے حد درجہ متاثر، تجربات کے دلدادہ، بحثوں میں طاق، حلقے کے شعرا میں سب سے کم عمر تھے۔ اسی نسبت سے نوجوانانہ خروش ان میں سب سے نمایاں تھا۔ آزادی سے کچھ قبل آل انڈیا ریڈیو سے متعلق تھے۔ اعجاز نے نظمیں بھی لکھیں ور افسانے بھی مگر ہر دو صنف میں تعمیر کا پہلو نمایاں ہے۔

تاجور سامری، مخمور جالندھری اور اقبال آذری (۱۹۱۵ء) آزادی سے قبل ہی معروف ہو چکے تھے۔ ان کے یہاں ترقی پسندی اور شاعری کے اُن نئے رجحانات کا ادغام نمایاں ہے جن کی داغ بیل لاہور میں پڑی تھی اور اصلاً جو مغرب میں رونما ہونے والے نئے شعری اور فنی رویوں ہی کی بازگشت تھے۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعے انھوں نے انسانوں کے دکھ درد سے معنی سیکھے تھے۔ وحدتِ انسانی میں نفاق پیدا کرنے والی ان قوتوں سے آگہی حاصل کی تھی جو اصلاً بشریت کش ہیں۔ افلاس، جہالت، پسماندگی، اوہام پرستی، محکومی اور استحصال کے اصل اسباب تک پہنچے تھے۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں بھوک سب سے بڑا مسئلہ تھا قحطِ بنگال کی یادیں ابھی تازہ تھیں کہ وطن کی تقسیم عمل میں آئی، ملک آزاد ہو گیا۔ گھروں گھر خون کی ہولی کھیلی گئی، جان کبھی اتنی ارزاں نہیں ہوئی تھی۔ خون کبھی اتنا سستا نہیں ہوا تھا۔ روٹی کے بھوکے انسانی بوٹیوں پر جھپٹ پڑے۔ ہر گلی ایک محاذ بن گئی۔ دہلی اور لاہور جیسی مردم خیز زمینیں لاشوں کی گزرگاہیں۔ ایسے سخت آزمائشی دور کا تجزیہ ان شعرا کی یادداشتوں میں محفوظ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک بار پھر مایوسی کی گہری دھند ان کے اعصاب پر چھا گئی، اب ان کی نواؤں میں تلخی اور کڑواہٹ تھی۔ غصے میں غضب تھا اور طنز میں بلا کی بے رحمی۔ پھر بھی

ان کی شاعری ہیجان میں یوں نہیں بدلی کہ ان کی اختیار کردہ بحور ترنم اور رواں تھیں۔ مسدس یا مخمس کے مقررہ فارم سے انھیں کم ہی دلچسپی تھی۔ تاجور نے ڈرامے اور افسانے بھی لکھے تھے۔ تنقیدی مضامین بھی ترقی پسند شعور رکھنے کے باوجود اشیاء کو سمجھنے کا ان کا اپنا انداز نظر تھا۔ شاعر اور سماج کے گہرے رشتہ کا انھیں احساس تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا شاعری برائے شاعری محض ایک کھیل اور دل بہلاوے کا فن ہے۔ سماج کا گہرا شعور شاعری کو ایک واضح سمت عطا کرتا ہے۔ اس نظریے کا اطلاق انھوں نے اپنی شاعری پر کیا۔ مفرس و معرّب تلفیظ (ڈکشن) اختیار کرنے کے بجائے آسان اور سہل زبان استعمال کی۔ اُن کی وابستگی عام انسان سے واضح تھی اسی لیے ان کے موضوعات قطعی واضح اور قصد بہ غایت نمایاں ہے۔ یہ نظمیں انسان دوستی کے جذبات سے معمور ہیں۔

آزادی سے قبل ہی تاجور سامری کے اظہار و فکر کے طریق میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ افسانوں میں انھوں نے جنس کے اس تصور کو تواتر کے ساتھ نمایاں کیا جسے ان کے معاصر مخمور جالندھری اور دیگر ترقی پسند شعراء اپنی نظموں میں بلا روک ٹوک پیش کر رہے تھے کہ جنسی کیفیات و جذبات کا بلا محابا اظہار بھی بغاوت کی دلیل ہے۔ تاجور نے جنس کے اس رجحان کو اپنی نظموں میں کم ہی پیش کیا۔ انھوں نے پابندی کے ساتھ معریٰ اور آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ بعض بڑے عمدہ ہیئت کے تجربے بھی کیے۔ ان پر یہ الزام بھی تھا کہ ان کے موضوعات تو شگفتہ اور تازہ ہیں مگر ہیئت کے اعتبار سے ان کی تخلیقات کمزور اور خشک ہیں۔ دراصل ترقی پسند مضامین کو تاجور نے نسبتاً نئے فنی سانچوں میں پیش کیا تھا نیز یہ کہ ان کی زبان غزل کی پرداختہ زبان سے مختلف تھی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اس "مکالماتی" عنصر کو بھی جگہ دی تھی جسے مخمور جالندھری اپنے فن میں بڑی خوبی کے ساتھ برت رہے تھے۔ یہی وہ میلانات تھے جن کے باعث تاجور کی نظموں کو اپنے عہد میں زبان اور ہیئت کے اعتبار سے کھردرا اور نامانوس خیال کیا گیا۔

مخمور جالندھری کا پہلا مجموعۂ کلام "جلوہ گاہ" تھا۔ جو آزادی سے چھ سات برس قبل شائع ہوا تھا۔ "تلاطم" ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جسے مکتبہ جدید لاہور نے شائع کیا تھا۔

ابتداء میں دل شاہجہاں پوری اور بعدازاں سیماب اکبرآبادی سے مشورہ سخن لیتے رہے۔ مختار صدیقی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں بھی سیماب اکبرآبادی کا تلمذ حاصل تھا۔ لیکن ان شعراء کا کلام سیماب کے اثر سے خالی ہے۔ مخمور ابتداء ہی سے ترقی پسند شعور رکھتے تھے لیکن لا ابد کی ان تحریکات نے بھی ان کے شعور کی تشکیل میں بڑا حصّہ لیا جن کا اصرار داخل کی تحریک پر تھا۔ جلوہ گاہ کی نظموں میں رومان وحقیقت کی کش مکش کا وہی رنگ نمایاں ہے جو دیگر معاصرین کے کلام میں بھی ایک قدرِ مشترک کا حکم رکھتا ہے۔ مگر یہ رومانیت اختر شیرانی کی نسائیت سے ملوث نہ تھی۔ وہ فطرت پسندانہ رجحان ہی تھا جس کے تحت ان کی حقیقت نگاری نے نمو پائی۔ وہ ایک ایک جز کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حقیقت اپنی پوری حرکت کے ساتھ لفظوں میں ڈھل جاتی ہے۔ حرکت جو اصلاً ڈرامے کی صفت ہے۔ "تلاطم کی بیشتر نظموں کا خاصہ ہے۔ مکالماتی ثنائیے، اشخاص کے نفسیاتی و داخلی تجزیے ان نظموں کی ڈرامائیت کو ابھارنے میں ممد ہیں۔ اس لحاظ سے بیس چہرے، تماشائی، اشتعال اور نیا مکان جیسی نظمیں لائق توجہ ہیں۔

مخمور کا وہ پہلا سفر جو جلوہ گاہ سے متعلق ہے۔ حقیقت پسندی کا پہلا باب ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے بھوکی جوانیوں کے نام معنون کیا تھا۔ انتساب خود ان کے اندازِ نظر کا بہترین مظہر ہے۔ اس مجموعے میں جنسی حقیقت نگاری کا وہ پہلو بھی روشن ہے جو منٹو کے افسانوں میں ایک پُرزور احتجاج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مخمور کے یہاں قدرے بے رحمی اور رجز مفاہمت در آئی ہے۔ مخمور نظم کہیں سے شروع کرتے ہوں مگر ان کی تان بالآخر جنس یا بھوک جیسے مسئلے پر ٹوٹتی ہے۔ جلوہ گاہ کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے۔

"گناہ کا کثرتِ استعمال ہی نوعِ انسان کو تقدس کا شعور دے سکتا ہے۔"

اور پھر بھوک کے سلسلے میں ان کا یہ تصور:

"ایک بھوکے کے ذہن میں روٹی کے خیال کے سوا کوئی اور تصور کیوں کر سما سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری زندگی کی روح فرسا تلخیوں کی علمبردار ہے۔"

ان کی عدم اطمینانی کا غماز ہے۔ مخمور نے تلاطم کو اقبالؔ کے ابلیس کے نام معنون کیا ہے جس سے ان کی ذہنی تڑپ اور جذباتی اشتعال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کنہیا لال کپور تلاطم کا پیش لفظ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

"بیشتر نقادوں کے نزدیک مخمورؔ جالندھری گردن زدنی و سوختنی ہے کیونکہ وہ بار بار یہ راگ الاپتا ہے ؎ اٹھیے بس اب کہ لذت خوابِ سحر گئی"

مخمورؔ نے 'زندگی جو کچھ کہ ہے اور جس صورت میں ہے اسی صورت میں اسے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اسی لیے وہ فطرت پسندوں کے اس گروہ سے ذہنی طور پر نزدیک ہیں' جو ماحول کے مقابلے میں انسان کو حقیر و ناتواں خیال کرتے ہیں اور جن کی دلچسپی پورے منظر و پس منظر کو معروضیت و برہنگی کے ساتھ نمایاں کرنے میں ہوتی ہے۔ مخمورؔ اپنے دور میں معتوب بھی ہوئے مگر انھوں نے اپنی راہ نہ بدلی۔

مخمور جالندھری کی ہیئتوں میں بے تکلفی مگر لہجے میں کھردراپن ہے۔ اخترالایمان کے یہاں کھردرے پن کی کیفیت بعد میں نمایاں ہوئی۔ یوں بھی مخمورؔ، اخترالایمان سے تین برس بڑے تھے۔ اخترالایمان نے اشخاص اور ان کے داخلی کردار کو بہت بعد میں اپنا موضوع بنایا۔ مخمورؔ کا تو سارا تمام و کمال ہی اس نوع کی نظموں سے عبارت ہے جن میں ڈرامائیت، خاکہ سازی، طنز اور تعریض کا پہلو جا بجا نمایاں ہے۔

تاجور سامری کی طرح مخمور جالندھری کو بھی بہت جلد فراموش کر دیا گیا۔ افسر آذری کا بھی آج کوئی نام نہیں لیتا۔ افسرؔ کا کلام 'فانوس' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ۴۲-۴۰ تک وہ رومانی طرز کے شاعر تھے مگر بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے تحت ان کے موضوعات کی سمت یک لخت بدل گئی۔ افسر کی بہترین نظمیں وہی ہیں جن میں حقیقت و التباس کا جمالیاتی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اپنی تمام تر سماجی وابستگی کے باوصف افسرؔ کی شاعری صحافت و پروپیگنڈے کے آثار سے دو چند دور ہے۔

۵۰ء کے ارد گرد ہی وہ نوجوان بھی تھے جن کی اصل پہچان ۶۰ء کے بعد قائم ہوئی۔ ترقی پسند تحریک بھیمڑی کانفرنس ۴۹ء کے بعد نظریاتی انتہا پسندی کا شکار ہو گئی۔ اب خطیبانہ لہجے

اور آواز کی بلندی بے اثر ثابت ہونے لگی تھی۔ مسائل تو اب بھی وہی تھے۔ محکومی سے نجات ملی مگر ایک ایسے سیاسی نظام کی جڑیں گہری ہوگئیں جس کے تحت سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کی رفتار میں کوئی خاص تیزی پیدا نہ ہوسکی۔ لسانی، علاقائی اور فرقہ وارانہ عصبیتیں جوں کی توں قائم رہیں۔ جاگیرداری ختم ہوگئی مگر سرمایہ داری کی لعنت سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ بعض ترقی پسند شعراء ان عنوانات پر برابر لکھتے رہے۔ اسلوب و ہئیت میں معمولی تبدیلی کے علاوہ ان کے کلام میں کوئی ایسی جدت نہیں تھی جسے اگلا قدم کہا جاسکے۔ اس دوران میں ادبی جمود کا نعرہ بھی بڑے زور و شور سے بلند ہوا۔

تقسیمِ وطن کے ارد گرد اردو ادبی رسائل کی تعداد میں زبردست کمی آگئی تھی۔ صفِ اوّل کے شعراء اپنے تخلیقی اور تنظیمی کاموں میں بدستور سرگرم رہے لیکن صفِ دوم کے شعراء جن کی شعر گوئی کی عمر ابھی کم ہی تھی، اپنے پیشروؤں کے اعادے پر قانع ہوگئے یا انھوں نے منظوم نعرہ بازی پر اکتفا کرلی اور بعض شعراء نے خاموشی پر تکیہ کرلیا۔ انھیں غیر یقینی حالات میں شاہراہ دہلی نے اپنی اشاعت کو جاری رکھا۔ درمیان میں کئی تعطلات بھی آئے مگر شاہراہ کسی نہ کسی طور پر چھپتے دبے تک جاری رہا۔ شاہراہ کا شمار ان معدودے چند رسائل میں کیا جاتا ہے جو اپنے عہد میں بے حد مقبول تھے اور جنھوں نے ترقی پسند تحریک کی ترویج و اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے مشتملات میں نظم، تنقید اور تبصرہ کا خاص مقام تھا۔ ساحر لدھیانوی، ظ۔ انصاری اور وامق جونپوری کے علاوہ پرکاش پنڈت اور یوسف جامعی نے بھی مختلف اوقات میں شاہراہ کی ادارت کے فرائض انجام دیئے تھے۔

ماحول (مدیر ظفر ادیب)، فن کار (مدیر پرکاش پنڈت)، اور شعاعیں (مدیران شیام سندر پرویز اور سلمیٰ صدیقی) جیسے رسائل بہت کم عرصہ جاری رہے مگر نوجوان ادبی حلقوں میں یہ کافی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ رسائل ترقی پسند تحریک کے مبلغ اور ترجمان تھے۔ تنقید، ترجمہ اور رپورتاژ کے علاوہ نظم کو فروغ دینے میں ان رسائل کا بڑا ہاتھ ہے۔ اکثر صفِ اوّل کے ترقی پسند شعراء غزل کی طرف متوجہ ہوچکے تھے مگر ان کی شناخت نظم ہی سے قائم تھی۔ بیشتر ترقی پسند نقاد و شعراء کے ذہن نظم کے لیے ایک

نرم گوشہ رکھتے تھے۔ پانچویں اور چھٹے دہے کے رسائل، نقادانِ فن کی تنقیدیں اور شعری مجموعے نظم کی اس زبردست لہر کے واضح ثبوت ہیں۔

تغیرات کے اثنا میں چیزیں اتنی واضح نہیں ہوتیں۔ ایک شکل جب دوسری شکل میں ضم ہوتی ہے یا ایک پیکر کسی دوسرے پیکر میں مدغم ہوتا ہے تو خط و خال کی تعین میں کچھ دیر لگتی ہے۔ یہی کچھ اس دور میں ہوا۔ ملک کے دیگر علاقوں میں بھی تغیر پذیری کی یہ صورت نمایاں تھی۔ قاضی سلیم، وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، عمیق حنفی اور سلیمان اریب وغیرہ کی ذہنی اور ادبی تربیت انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر سایہ ہوئی۔ ۱۹۶۰ء تک ان شعراء کے موضوعات و رویوں پر کسی نہ کسی لحاظ سے رومانیت و ترقی پسندی کے اثرات غالب تھے۔ مخدوم، سردار، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی وغیرہ کی شاعری کے شور میں انھیں اپنی آواز کی تلاش تھی۔ اختر الایمان اور مجید امجد کے شعری تجربات نے، جو مقبولِ عام محاورے کی نفی کرتے تھے۔ ان کے ذہنوں پر مہمیز کی۔ مغرب کی جدید ادبی اور فنی تحریکات و اسالیب سے بھی ان کی واقفیت گہری تھی۔ پاکستان میں ترقی پسند تحریک پر سیاسی قدغن لگنے کے بعد ہی سے علامتی اور تجریدی اسالیب کی طرف نئے شاعروں کے ذہن منعطف ہونے لگے۔ پاکستانی رسائل کے توسط سے ہندستان کے نئے اردو ادیبوں کو بدلتے ہوئے نئے تناظرات کا علم ہوا۔ اس ضمن میں سہ ماہی "سوغات" (کراچی و بنگلور) کا جدید نظم نمبر ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ سوغات نے نئے نئے مباحث اٹھائے، نئے شعری تجربات کا خیر مقدم کیا اور مختلف نقادوں اور ادیبوں سے نئی نظموں کے تجزیے کرائے۔ مغربی نقادوں کے اہم مضامین کے تراجم شائع کیے۔ ایک طور پر جدید نظم کے فروغ کے سلسلے میں سوغات نے بنیادی کام کیا تھا۔

سوغات کی اشاعت کے فوراً بعد دہلی سے "تلاش" نام کے ماہنامے کا اجرا عمل میں آیا۔ وشوناتھ درد جس کے مدیر تھے۔ درد خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے ذہن میں کرید تھی جس کا نتیجہ تلاش کی صورت میں سامنے آیا۔ تلاش بہت جلد ایک مقبول جریدہ بن گیا۔ تلاش نے یقیناً نئی شاعری کے لیے بڑی راہ ہموار کی۔ تلاش نے ابھی قدم جمائے

بھی نہیں تھے کہ یکایک بند ہوگیا۔ اس کمی کو "تخلیق" ۶۳ء نے پُر کر دیا۔ تخلیق نے مارچ ۶۴ء میں ایک خاص نمبر نکالا جو جدید بالخصوص مختصر نظموں سے متعلق مباحث پر مشتمل تھا۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا نمبر تھا جس میں جدید مختصر نظم کو موضوعِ بحث بنایا گیا تھا۔ اختر الایمان کو ابھی ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا تھا۔ محمد حسن ان کی نظموں کی تکنیک اور علامیت پر ایک مبسوط مقالہ لکھ چکے تھے جسے سوغات نے اپنے جدید نظم نمبر میں شائع کیا تھا۔ مگر تخلیق میں اختر الایمان کو اکثر موضوعِ بحث بنایا گیا۔ جس کے باعث ان کی شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں نئی راہیں روشن ہوئیں۔ ایک خاص شکل میں جدید نظم کی تحریک کو فروغ دینے میں تحریک (مدیر: گوپال متل) کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ تحریک ایک نیم سیاسی ادبی پرچہ تھا جو کم و بیش ۲۵ برس تک جاری رہا۔ مخمور سعیدی جو مزاجاً کلاسیکی ذہن رکھتے تھے تحریک کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔ نوجوان مخمور سعیدی نے بہت جلد کلاسیکی جکڑ بندیوں سے فراغت پائی اور جدید شعراء کی شیرازہ بندی کے کام کو بڑی حسن و خوبی سے انجام دیا۔

گوپال متل ایک ذہین اور باشعور فن کار تھے۔ ترقی پسندی سے سیاسی سطح پر انھیں کد تھی۔ جس طرح ترقی پسندوں کی سیاسی وابستگی اور اس کی سمت اظہر من الشمس ہے اس طرح گوپال متل کی سیاسی طرفداریاں بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ بہر طور ہر دو طرف وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں تھی اور یہی ثبوت غالب کے طرفدار فراہم کرتے رہے گوپال متل کی تحریروں میں احتساب کا پہلو نمایاں تھا۔ قلم کی جنبش میں اس درجہ یکسانیت واقع ہوگئی تھی کہ تحریک کے قارئین عنوان سے پہلے گوپال متل کا نام دیکھ کر ہی مضمون بھانپ لیتے تھے۔ اس مخصوص کردار کے باوجود تحریک کی تحریک کا نوجوان اذہان نے اثر ضرور قبول کیا۔ اس کے لکھنے والوں میں تقریباً تمام نئے ادیب تھے جو وقتاً فوقتاً تحریک کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوالات میں بھی گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے۔

دلی کے ان رسائل کے علاوہ شب خون الٰہ آباد، کتاب لکھنؤ، مزاج بھوپال، جواز مالیگاؤں، غبار خاطر اورنگ آباد، اقدار کلکتہ، شعر و حکمت حیدرآباد، الفاظ علی گڑھ، ہم زبان مالیگاؤں، اظہار بمبئی وغیرہ نے نئی نظم کے مشن کو بہانی آگے بڑھایا۔ خاص طور پر شب خون نے ساری فضا

ہی بدل دی۔ اب تک جدیدیت عملی مسئلہ نہیں بنی تھی۔ جدید نظم اور اس کے اختصار، جدید نظم میں علامتی رجحان جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ، شاعری کے نئے اسالیب وغیرہ پر اکا دکا سرسری مضامین تو لکھے جا رہے تھے۔ جدید شاعری کی جمالیات، اس کے ابہام کی جمالیاتی نوعیت، نئی شاعری اور قاری کے رشتے، نئی اور پرانی شاعری کے اصل فرق، روایت اور کلاسیکیت کے اصل مفاہیم پر پہلی بار شمس الرحمن فاروقی نے قلم اٹھایا اور ان کی ان میں جدید شاعری اور اس کا کردار ایک اہم بحث طلب موضوع اور مسئلہ بن گیا۔ کتاب لکھنؤ کے دروازے سب کے لیے وا تھے۔ مگر چونکہ لکھنے والے ہی نئے تھے سو کتاب کی شمولیت میں نئے شعراء کا عدد زیادہ ہوتا تھا۔ گفت گو ایک واحد ترقی پسند رسالہ تھا جس کی اپنی حدود تھیں اس کی مقبولیت کا سبب تحریک سے زیادہ سردار جعفری اور ان کی شخصیت تھی۔ سردار کا مطالعہ بسیط تھا اور ان کی نظر قدیم و جدید پر یکساں تھی۔ وہ ترقی پسندی کے تسلسل یا احیاء کے لیے نئے استدلال قائم کر سکتے تھے۔ تبدیل شدہ سیاق میں ترقی پسندی کا کردار کیا ہو؟ جدید مفہوم میں اس کی معنویت؟ اس کو برقرار رکھنے کا جواز؟ وغیرہ سوالات پر سردار مضبوطی کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ مگر وہ لکھ نہ پائے نتیجۃً گفت گو کے شمارے انتخاب کی سطح سے بلند نہ ہو سکے۔

جرائد و رسائل ہمارے وہ میڈیا ہیں جن سے ہوا کے رُخ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لیے میں نے ان رسائل کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے اور جنھوں نے نظم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

شاہراہ اور ماحول جیسے اہم رسائل کے بعد کئی اہم رسالے اور جریدے شائع ہوئے۔ عصری ادب، سطور، تناظر، معیار، شعور اور عصری آگہی، تناظر کی اپنی کوئی پہچان نہ بن سکی۔ معیار محض انتخاب بن کر رہ گیا۔ شعور کو بائیں بازو کا ترجمان کہا گیا مگر اس کی ہمدردیاں ہر کس و ناکس نئے ادیب کے ساتھ تھیں۔ شعور ایک چھپا انتخاب ضرور ثابت ہوا۔ مین را نے اس کی ترتیب میں اپنی بہترین مدیرانہ صلاحیت کا ثبوت بہم پہنچایا، تاہم یہ ضخیم و دیدہ زیب جریدہ تخلیقی ذہنوں پر کوئی خاص اثر قائم نہ کر سکا۔ عصری ادب کے مدیر

پروفیسر محمد حسن نے بڑے استقلال کے ساتھ اپنی سعی جاری رکھی۔ وہ ادب کی سماجیات کے ساتھ ساتھ جمالیات کے بھی زبردست قائل ہیں۔ ایک بیباک صحافی ہونے کے ناطے انھوں نے اپنے قلم کے جملہ حقوق محفوظ رکھے۔ عصری ادب گزشتہ کئی برسوں سے بڑے استقلال و یکسوئی کے ساتھ سرگرم سفر ہے۔ کچھ برسوں تک عصری آگہی بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ پروفیسر قمر رئیس اس کے مدیر تھے۔ عصری آگہی میں صرف وہی تخلیقات شائع کی جاتی تھیں جن کی سمت واضح تھی۔ یعنی یہ کہ وہ جدید ادیب جن کا فن علامتی تجریدی نگاری پر استوار ہے اور جن کا ابہام جمالیاتی قدر پر منتج ہے عصری آگہی کے باب ان پروا تھے۔ قمر رئیس انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود نظریاتی انتہا پسندی کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصری آگہی کے لکھنے والوں میں بیشتر وہ ادیب تھے جن کا تعلق ۷۰ء کے بعد پروان چڑھنے والی نسل سے تھا۔ دہلی میں قمر رئیس اور محمد حسن نے اپنے تنقیدی مضامین میں خالی خولی تجربہ پسندی، انتہائی خود کوشش علامت پسندی، غیر ضروری ابہام اور سماجی آگہی سے خواہ مخواہ بیزاری پر سخت گرفت کی۔ نتیجتہً ۸۰ء کے بعد جدیدیت کی رو میں وہ شدت قائم نہ رہ سکی۔

محمود ہاشمی دہلی میں جدید نظم کے پہلے گروہ کے معنوی نقاد تھے۔ ان کی تنقید نزاعی اور ہنگامی تھی۔ جدید ذہنوں کو بنانے اور بگاڑنے میں ان کی تحریروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ۶۵ء اور ۷۰ء کے بعد ان کے یہاں جو شدت پیدا ہوئی تھی وہ جلد ہی روبہ زوال ہوگئی۔ ہاشمی کی تنقید اور جملہ بازی اب محض ایک حوالہ بن کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے لکھنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا قیام کئی برس دہلی میں رہا۔ اس دوران انھوں نے کلاسیک پر زیادہ لکھا۔ اب ان کا زور لسانی شکست وریخت یا محض صرف ہیئت کے کم کوش تجربوں پر نہیں بلکہ روایت کے گہرے شعور پر تھا۔ فاروقی نے نئے سے نئے اہم اور غیر اہم ہر طرح کے تجربات کو لبیک کہا مگر اپنی بہترین تنقید میں رومانی خروش کے بجائے کلاسیکی جمالیات اور اس کے احیاء پر ہی ان کا سارا زور ہے۔ اسلوب شعر میں سبک ہندی کو از سر نو ترویج دینے کا سہرا بھی فاروقی ہی کے سر ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لسانیات و

اسلوبیات کے ماہر ہیں مگر جدید شعرا کی طرفداری میں انھوں نے تحریر سے زیادہ تقریریں کیں۔ بعض مضامین میں انھوں نے علامت، استعارہ اور تمثیل پر عالمانہ بحث کی اور تخلیقی زبان کے اِن وسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ گوپی چند نارنگ اور قمر رئیس کا اصل مسئلہ فکشن ہی تھا اور فکشن کے حوالے ہی سے ان حضرات نے اقدار و رویوں کی بحث اُٹھائی۔

دہلی ایک عظیم تہذیبی مرکز بھی ہے۔ ادبی جلسوں اور مذاکروں کا گڑھ۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر ادیب اور نقاد یہاں کی ریڈیائی محفلوں ٹی۔وی کی بزم یا ادبی سیمیناروں میں حصہ لے چکا ہے۔ بعض حضرات کا یہاں ملازمت یا پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے کئی برس قیام رہا۔ انھیں میں شمس الرحمٰن فاروقی اور قاضی سلیم بھی ہیں۔ یہاں میں صرف انھیں شعراء کا ذکر کر رہا ہوں جو نظم گو ہیں یا جن کی تحریروں نے جدید شعری اسالیب کی ترویج اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آزادی کے بعد ساغر نظامی نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے موضوع اور تاریخ پر ایک طویل ڈرامائی رزمیہ نظم (۱۹۸۰ء) لکھی۔ یہ ایک بلند کوش منصوبہ تھا جسے انھوں نے بڑے حسن و خوبی کے ساتھ تمام و کمال تک پہنچایا۔ ساغر نظامی سیماب اکبرآبادی کے لائق تلامذہ میں سے تھے۔ بادۂ مشرق تک کی نظمیں حالی، سرور جہان آبادی، چکبست اور سیماب اکبرآبادی ہی کی تکنیکی روش کا اعادہ کہی جا سکتی ہے۔ فطرت اور وطن سے والہانہ اُنس ان کی بیشتر نظموں کا محرک ہے۔ مشعلِ آزادی میں کئی ابواب ان کی قادرالکلامی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن ان حصوں کی بھی کمی نہیں جہاں تخلیقی جودت کے آثار بھی کھل کر نمایاں ہوتے ہیں۔ اکثر جگہ بحروں کا تنوع اور ترنم یک لخت دامن دل کھینچ لیتا ہے۔ علاوہ اس شاہکار کے وہ نظمیں جو اس اثنا کی پیداوار ہیں، ساغر کی اپنی مخصوص افتادِ طبع کی مظہر ہیں اور اپنے عصر کی تاریخ سے مضبوط رشتے کا پتہ دیتی ہیں۔ ساغر کے علاوہ تلوک چند محروم، منور لکھنوی، آمن لکھنوی، تَرش ملسیانی اور بسمل سعیدی کی نظموں کے موضوعات بھی وطن، فطرت، اخلاق اور کہیں کہیں ہلکی پھلکی رومانیت سے وابستہ ہیں۔

آزادی کے بعد دہلی میں جو ترقی پسند شعراء تھے ان میں سب سے نمایاں نام

غلام ربانی تاباں کا تھا، جنھوں نے چین کے حملے کے بعد نظم نگاری ترک کر دی اور گزشتہ نظموں سے تائب ہو گئے۔ نیاز حیدر استقلال کے ساتھ کسی ایک مقام کو مستقر نہ بنا سکے وہ اپنی نظموں میں ایک صاعقہ بردار سپاہی کی طرح للکارتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم میں خیال اپنی وحدت میں راہ پاتا ہے نہ اس کی تخلیقی توسیع اور تکمیل کا کوئی پہلو روشن ہوتا ہے۔ نیاز حیدر احتجاجی شاعری کا محض ایک حوالہ ہیں۔ البتہ پیکر تراشی کے فن میں ان کی انفرادیت مسلّم ہے۔

بعض شعراء کی ترقی پسندی دوٹوک ہے اور بعض کے یہاں محض عادتاً یا رسماً سماجی اور خارجی موضوعات کی طرف میلان برقرار رہا لیکن ایک بات قطعی واضح ہے کہ وہ شعراء جو ترقی پسند مسلک پر بدستور قائم تھے ان کی ہیئتوں اور اسالیب میں اب انفرادی اپروچ بھی نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ پرانے مقررہ سانچوں سے وہ بھی اکتا چکے تھے۔ ترقی پسند نظموں کی متداول تکنیکیں اب CLICHES میں بدل گئی تھیں۔ سجاد ظہیر اور بعد ازاں محمد حسن کی نثری نظمیں اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔ اس نوع کا تجربہ حسن شہیر (لکھنؤ) پہلے ہی کر چکے تھے۔ اگرچہ ان حضرات نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اس قسم کی نظموں کا تجربہ کیا تھا، تاہم یہ نظمیں ترقی پسند شعراء کے بدلتے ہوئے مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ نسیم کرہانی، نریش کمار شاد، سلام مچھلی شہری، کمال احمد صدیقی، رفعت سروش، قمر رئیس اور اجمل اجملی وغیرہ کی شعری ہیئتوں میں تبدیلی ہماری توجہ کی مستحق ہے۔

گوپال متل ہمارے بزرگ کہنہ مشق شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظم کے بدلتے ہوئے رجحانات پر گہری نظر رکھی۔ سیاسی سطح پر بھی وہ مارکسی تحریک کے کٹر مخالف تھے۔ ادب کے سیاق میں بھی ان کی توجہ کا مرکز وہی شعرا اور ناقدین رہے جنھوں نے اپنی جمالیات کی اساس مغرب کے نئے تجربوں پر رکھی تھی۔ گوپال متل بنیادی طور پر شاعر تھے، انھوں نے بہت جلد اپنے آپ کو نئے شعری سیغے میں ڈھال لیا۔ صحرا میں اذان یا اس کے بعد کی نظموں کو دیکھ کر کسی کو شائبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ وہی شخص ہے جو ۴۰-۴۵ سے لکھتا آ رہا ہے۔ گوپال متل کی مختصر نظمیں اپنے داخلی تکلم اور نرم رو لہجے کی وجہ سے اپنا ایک حُسن رکھتی ہیں۔

دہلی میں ۶۰ء کے بعد کی شاعری بالعموم انھیں شعری رجحانات واسالیب کی توثیق ہے، جو برصغیر ہند وپاک میں جاری وساری تھے۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں کہ جدید نظم کے اوّلین دستے پر ترقی پسند فکر کا اثر بھی نمایاں ہے۔ ابھی یہ نوجوان گومگو کی کیفیت میں تھے۔ مغرب کی ادبی تحریکات ورجحانات اور جدید تنقید کا علم ابھی تازہ تھا، مشق جاری تھی، ابھی وہ ہنر نہیں آیا تھا کہ علم کے ذریعے تجربے کی سعادت حاصل ہوجائے۔ یہی سبب ہے کہ وہ شعراء جن میں سراج کومل، عمیق حنفی، زبیر رضوی اور مخمور سعیدی پیش پیش تھے یک لخت جدید نہیں بن گئے۔ انھیں نئے لسانی محاورے کی تلاش تھی، اپنے وجود کا شدید احساس اور اپنی انفرادیت کی جستجو تھی۔ انسان دوستی کا نیا تصور تھا، سائنس اور ٹکنالوجی کے ہوشربا ترقی نے جس شور سے معمور کلچر کی داغ بیل ڈالی تھی اس سے بیزاری تھی۔ حقیقت کے میکانکی تصور کی نسبت حقیقت کے اس اضافی تصور پر ترجیح تھی جس کے تحت حقیقت کئی ابعاد رکھتی ہے، مسلسل تبدیلی اس کی بالیدگی اور پیچیدگی ہی کی دلیل ہے۔ اس معنی میں قطعیت خود ایک اضافی قدر ہے۔ ان شعراء نے نظریاتی وابستگی کو بھی اس لیے شک کی نظر سے دیکھا کہ نظریہ ان کی روشن خیالی اور ضمیر کی آزادی کے حق میں سدِ راہ تھا۔ انھیں ان اقدار کی تلاش تھی جو ابدی ہوں اور جو اپنی ہر صورت میں بشریت کی امین اور انسان کی داخلی آزادیوں کی محافظ ہوں۔

سیاسی عدم وابستگی، داخلی آزادی اور انفرادیت پسندی کے یہ تصورات ترقی پسندی کا رد ہیں۔ آزادی سے قبل میراجی کی تنقیدوں اور تجزیوں میں ان کی طرف اشارے ضرور ملتے ہیں تاہم نئی جمالیات کی تلاش کا یہ مقصد بڑا بلند کوش اور پرکشش تھا۔ تنقید کو ترقی پسند تحریک نے جو ایک استحکام عطا کیا تھا، اس کی توسیع جدید نقادوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ تنقید میں کئی نئی ادبی اصطلاحات کا اضافہ ہوا اور شاعری میں ہیئت واسلوب کے تجربوں کی ایک باڑھ سی آگئی۔ لسانی سطح پر بھی نئی تشکیلات عمل میں آئیں۔ لفظوں کے تخلیقی استعمال پر زور دیا گیا۔ پہلی بار وہ تجربے بھی کیے گئے جن میں لفظ اپنے خود کار عمل سے گزرتے ہیں۔ ابہام اور اہمال کی حدیں خلط ملط ہوگئیں اور ادب میں ترسیل وابلاغ

کا مسئلہ ایک شدید صورت اختیار کر گیا۔

عمیق حنفی جدیدیت کے مبلغوں میں سے تھے۔ انھوں نے اپنا شعری سفر ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ شروع کیا تھا مگر جلد ہی آزادیٔ ضمیر کے حق میں ہو گئے۔ احتشام حسین مرحوم سے ان کی بحث کی یادیں آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔ عمیق حنفی ایک پارہ صفت ذہن رکھتے تھے۔ ان کا تاریخ، عمرانیات، تہذیب، مذہب اور موسیقی کا مطالعہ وسیع تھا۔ مطالعے کی اسی وسعت کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر کبھی یکسو نہ رہے۔ ابتداء میں وہ وابستہ تھے، درمیان میں عدم وابستگی کا دم بھرنے لگے اور آخر آخر میں انھیں 'بدھ'، 'عیسیٰ'، 'محمدؐ' اور مارکس کے فکری نظاموں میں ایک وجدانی اور الہامی وحدت کا احساس ہونے لگا۔ طرہ یہ کہ انھیں ایسا "بدھ کے سکوت اور مارکس کے یقین انکار کے باوجود ہوتا ہے ــــ"
(عمیق حنفی: شجر صدا: مقامات)۔

عمیق حنفی کی نظمیں ہیئتی تنوع کے باوجود فکر کے بسیط پس منظر ہی سے نمو پاتی ہیں۔ ان کی اکثر نظموں کا لمسی، سماعی اور بصری کردار فطرت کی رنگا رنگی، بلاخیزی اور آواز سے معمور منظر و پس منظر پر منتج ہوتا ہے۔ یہاں فطرت کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کرنا درست ہو گا کہ یہ لفظ خود عمیق حنفی کو بے حد عزیز ہے۔ لفظ جنگل کے ساتھ ہی حرکت، اژدہام اور بھرے بھرے پن کا تصور بھی جڑا ہوا ہے۔ جنگل کی قبائلی خود کاری جیسا اسلوب اکثر ان کی نظموں کے کنارے توڑ دیتا ہے۔ نظم پر کھی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔

عمیق حنفی کی آزاد نظم سردار جعفری، مجید امجد اور قاضی سلیم کی آزاد نظم سے اگلا اقدام ہے۔ ان کا کھردرا لہجہ اور لفظوں کے استعمال میں نثر کی سی منطق کا استعمال، یقیناً مجید امجد کی یاد دلاتا ہے۔ مگر عمیق اپنی فکر کے جغرمٹ میں مجید امجد سے کہیں آگے ہیں۔

عمیق حنفی کے معاصروں میں بلراج کومل کا شمار بھی دہلی کے ان شعراء میں کیا جائے گا جن کی انفرادیت ۶۷ء کے بعد واضح ہوتی ہے۔

اکیلی، زمین کے طوطے، سرکس کا گھوڑا، کاغذی ناؤ اور ایمبولینس کا شاعر لفظوں کی تازہ کاریوں اور آزاد نظم کے خلاقانہ استعمال کے باوجود اتنا مشکل اور پیچیدہ نہ تھا

جتنا اب ہے۔ بلراج کومل کی شاعری کے بارے میں وحید اختر نے ۷۰ء میں یہ بات لکھی تھی۔

"اپنے موضوعات اور رویے کے لحاظ سے وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کی ہی توسیع کرتے ہیں لیکن ان کا طرزِ اظہار بالکل مختلف ہے۔ ان کی نظم پر نہ تو راشد کا اثر ہے، نہ سردار جعفری کا۔ آزاد نظم میں ان دو اثرات سے محفوظ رہنا بڑی چیز ہے۔"

'میری نظمیں' ۵۴ء میں چند نظموں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کسی جز، مصرع یا ضمنی خیال میں ترقی پسند رویے کی جھلک ملتی ہے مگر اپنی بیشتر نظموں کے اسلوب اور تلفیظ (ڈکشن) میں بلراج کومل بڑی حد تک علاحدہ ہیں۔ بقول ان کے۔

"اس (میری نظمیں) مجموعے میں کوئی نظم ایسی نہیں جو کسی کلیہ کی پیداوار ہو۔" ص ۱۵

چونکہ یہ نظمیں مقبول عام محاورے کی نفی کرتی ہیں اس لیے بعض حضرات کو یہ نامانوس اور مبہم محسوس ہوئیں۔ خود بلراج کومل لکھتے ہیں:

"بعض نظمیں کسی حد تک مبہم ہیں اور میں ان کا خالق ہونے کی حیثیت سے صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کا ابہام سیاسی نوعیت کا نہیں صرف ادبی نوعیت کا ہے۔" ص ۱۵

بلراج کومل کی نظموں کی تکنیک عام دھڑے سے الگ ہوتی ہے اس لیے اس میں ابہام کی ہلکی سی کیفیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تاہم سفر مدام سفر تک کی شاعری ابہام کے موجودہ تصور سے بری ہے۔ اس میں جذبے کی چمک پوری طرح نمایاں ہے۔ انسان کی بنیادی معصومیتوں اور انسانی رشتوں کے تقدس کا احساس ابھی زندہ تھا۔ شاعر کا ذہن حال سے ناآہنگ مگر ماضی کی چند خوشگوار یادوں سے منور تھا۔ بلراج کومل کی آواز دور سے آتی ہوئی آواز سے مماثل تھی۔ سفر مدام سفر کے بعد آہستہ آہستہ جذبہ تعقّل میں بدل گیا۔ ان کے لسانی تجربوں میں کلاسیکی معروضیت جڑ پکڑتی گئی۔ قطعی فنی دروبست کی سعی اور فارسی الفاظ و تراکیب کی جابجا آمیزش نے اکثر نظموں کو خوبصورت لفظوں اور پیکروں کا ایک جھرمٹ تو بنا دیا مگر تخلیقی تاثر سے وہ محروم ہو گئیں۔ ہمارے دور میں راشد کی نظم سبکِ ہندی کا سب سے خلاقانہ پیکر مہیا کرتی ہے۔ راشد کی فکر بسیط تھی۔ زبان کو کسی بھی طور پہ آزمانے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ معنی سے بعید معنی کی جستجو ان کا ہنس کھیل تھا۔ وحید اختر نے ساتویں عشرے میں

یہ صحیح کہا تھا کہ ان کی شاعری راشد کے اثر سے دور ہے مگر اب اگر انھیں قلم اٹھانا پڑے تو وہ سب سے پہلے اس اثر بلکہ رعب کی بات دہرائیں گے کہ بلراج کومل کی زبان میں جو جھل پن در آیا ہے وہ محض راشد کی خالی خولی پیروی کا نتیجہ ہے۔

باوجود اس کے بلراج کومل اب بھی اپنے تمام معاصرین سے علاحدہ ہیں۔ ان نظموں نے ان کے تخلیقی سرمائے کو تو انگر کیا ہے۔ داخلی حس کے بجائے داخلی کشود نے اگر ان کے فن میں جگہ لے لی تو ان کی آواز یقیناً سب سے مستحکم ہوگی۔

حیرت کا مقام ہے کہ واہمے اور خواب کا جو ایک خوبصورت اشتراک کمار پاشی کی ابتدائی نظموں کا خاصّہ تھا ایک موسم میرے دل کے اندر ایک موسم میرے باہر کی نظموں میں دور دور تک اس کے نشان نہیں ملتے۔ نئے اسطور خلق کرنے والا شاعر جو ہمیشہ نامعلوم حقائق کی جستجو میں سرگرم رہتا تھا "اپنے سَتری کروں کو تج کر پہچان میں آنے والی دنیا کو لمحہ لمحہ رقم کرنے لگا ہے۔ کمار پاشی نے حقیقت سے نیا رشتہ ضرور قائم کیا ہے، مگر اس رشتے کی نوعیت تخلیقی ہے۔ اس نواح میں بھی انھوں نے نظم کی داخلی تجرید اور زبان کی تخلیقی حس کو پوری طرح برقرار رکھا ہے۔ ان نظموں کا باطن کا پورا آشکار ہونے کے باوصف اسے آر پار نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی رشتوں کے پامالی کے دور میں ان رشتوں کے تقدس اور خوبصورتی کا احساس ان کی اکثر نظموں میں تہ نشست ہے۔ یہ نظمیں بلاشبہ انسانی دردمندی جیسے بیش قیمت جذبے سے معمور ہیں۔

اس نوع کی دردمندی زبیر رضوی کے بعد کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ زبیر کی ابتدائی رومانیت اب رومانی سریت میں بدل گئی ہے۔ اخلاقی اقدار کی شکست سے جو ایک عظیم خلا رونما ہوا ہے، زبیر کی موجودہ نظمیں اس کا نوحہ ہیں۔ زبیر کی نظموں کا مدنی سیاق جو انھیں ہمیشہ عزیز رہا ہے علی بن متقی رویا کے سلسلے کی نظموں میں مفقود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یک دم شاعری میں انتظار حسین سے ہمارا سابقہ پڑا ہو۔ گو کہ انتظار حسین کی زبان و اسلوب پر داستان، اسطور، ارشادات اور مذہبی صحیفوں کی چھاپ گہری ہے مگر المیہ دونوں کا ایک ہے۔ زبیر لفظوں کا طلسم نہیں باندھتے، حکائی

لہجہ میں بات کرتے ہیں اور نظم میں ایک سے زیادہ تاثرات کی شیرازہ بندی نہیں کرتے پہلے بھی ایجاز ان کا بہترین حرف وصف تھا اور اب بھی وہ بڑی مضبوطی کے ساتھ اس ہنر پر کاربند ہیں۔

شہاب جعفری کے ذہن کی پرداخت ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ ہوئی مگر شہاب جعفری کے تخلیقی عروج کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عین زوال کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند صفوں میں انتشار رونما ہو چکا تھا، آدرشوں کا طلسم ٹوٹ رہا تھا، خواب سازی محض ایک میکانکی عمل بن کر رہ گیا تھا۔ شہاب کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ وابستگی ان کا ایمان تھی مگر نئے حقائق سے انکار اتنا آسان نہ تھا۔ شہاب نے یہ راہ نکالی کہ وابستگی کی حدود کو وسیع کرکے اپنے ضمیر کی حدود سے اسے ملا دیا اور اپنی اندرونی آزادی کو بروئے کار لے آئے۔

شہاب جعفری کی نظموں کا افق وسیع ہے۔ وہ تضاد اور اکہرا پن جو جدید مدنی معاشرے کے اعصاب میں جہاں تہاں کارفرما ہے۔ شہاب نے اسے اپنی اکثر نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ زبان کا عمل چونکہ راست ہے اس لیے آہنگ بھی اکثر بلند ہو جاتا ہے۔ زبان میں کلاسیکی ضبط کا بھی وہ لحاظ رکھتے ہیں، ڈرامے سے خصوصی نسبت ہے اس باعث چیزوں کو وہ صاف اور پوری حرکت کے ساتھ پیش کرنا جانتے ہیں۔ ملیانہ کے فساد پر لکھی ہوئی ان کی تازہ نظم اصلاً انسانیت کا نوحہ ہے۔

مخمور سعیدی پورے وقار اور کلاسیکی استقلال کے ساتھ غزل کے ساتھ نظم کی طرف مائل ہیں۔ انھوں نے لسانی حرمتوں کا لحاظ رکھا مگر نظم کو داخلی حبس کا شکار نہیں ہونے دیا۔ یہی صورت مظفر حنفی کی نظموں میں آشکار ہے۔ دونوں کے یہاں ایک مسلسل داخلی بے چینی کارفرما ہے۔ معلوم کا کرب نامعلوم کی تڑپ۔ کرشن موہن تا بہ ہنوز سرگرم اور جوان ہیں کہ انھوں نے اپنے باطن اور یادداشت کو بے حد محفوظ رکھا ہے ان کی شاعری اب ویوگ کے تجربوں پر استوار ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ باطن کی یہ غواصی اور نامعلوم حقائق کو گرفتار کرنے کی یہ تڑپ تا بکے قائم رہتی ہے۔ اسی طور پر راج نرائن راز

کے سفر کی سمت اب سخت موسموں کی طرف ہے، لفظوں کی یک جہتی کو انھوں نے توڑا ہے۔ وہ اسلوب جو بے حد سادہ اور مانوس تھا، راز کی نئی نظموں میں قائم نہیں رہ سکا۔ راز کی نظمیں تخلیقی تاثر پارے ہیں، جن میں تجرید کا عمل غیر محسوس طور پر پہلو بہ پہلو جاری رہتا ہے۔ راز پہلے بھی ضبطِ کلام کی ایک نمایاں مثال تھے، اور اب بھی انھیں اپنے تاثر کو تلازمات کے سہارے طول دینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اندر سروپ دت نادان گزشتہ ۲۵ برس سے شاعری کر رہے ہیں۔ وہ کہنہ مشق ہیں مگر کبھی انھوں نے اپنے آپ کو دریافت کرنے کی جستجو نہیں کی تھی۔ پچھلے کچھ برسوں سے ان کی نظموں میں انفرادیت کے نقوش واضح دکھائی دینے لگے ہیں۔ نادان انھیں نظموں میں کامیاب ہیں جو مختصر ہیں۔ کسی خیال کو کم سے کم لفظوں میں اس طور پر ادا کر دینا کہ داخلی تجرید کے باوجود تاثر کا طلسم برقرار رہے اور نظم کی جمالیاتی وحدت پر بھی کوئی حرف نہ آئے، ایک مشکل عمل ہے۔ نادان کی اکثر نظمیں اس فن کی آئینہ دار ہیں۔

وہ شعراء جو اب چالیس پینتالیس کی عمروں کو پہنچ رہے ہیں، ان میں صادق کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس عمر کے بیشتر دوسرے شعراء نے نظم کو خیر باد کہہ کر غزل کے دامن میں جائے پناہ ڈھونڈھ لی۔ صادق نے اپنے شعری سفر کے ابتدائیے ہی میں غالباً اردو میں پہلی بار (۱۹۶۰ء) نثری نظم کا تجربہ کیا تھا۔ انھوں نے ایک سے زیادہ نثری نظمیں لکھی تھیں مگر رسائل اور اردو معاشرہ جو ابھی تک غزل کے کلچر سے آزاد نہیں ہوا تھا نثری نظم کے پیراڈکس کو قبول نہ کر سکا۔ صادق کا ذہن تجربہ پسند ہے اور یہ تجربہ پسندی ان کے موضوعات سے لے کر زبان و ہیئت کے عمل میں بھی پوری طرح مترشح ہے۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظموں میں انسانی اقدار کی پامالی اور موت کے جبر کو موضوع بنایا ہے۔ وقت کی کاٹ جو اندھا ہے ہرے بھرے تناور درختوں جیسے انسانوں کو بڑی بے دردی سے قاشوں میں بدل دیتی ہے۔ انسانی جسم کی اس بے حرمتی اور ناطاقتی کا شعور ہی دانشِ حاضر کا عذاب ہے۔ وجود کا یہ کرب صادق کی نظموں کو نمایاں کردار ہے۔ موجودہ اور مشمولہ نظموں میں صادق کا آہنگ نثری ہے مگر لسانی کردار تخلیقی ہے۔ اسی لیے معنی کی

سطح پر یہ نظمیں کسی قدر پیچیدہ ہیں۔ اختر الایمان ، کمار پاشی ، عمیق حنفی اور ہندی کی جدید بر افروختہ شاعری کے اثرات نے بھی صادق کے شعری سفر میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ ان ذہنی رشتوں کے باوجود صادق کی اپنی انفرادیت واضح اور لہجہ کھرا ہے۔

اُردو نظم کا یہ سفر ابھی جاری ہے۔ میں نے بساط بھر یہی کوشش کی ہے کہ مشمولہ شعراء کی بہترین نظموں کا انتخاب پیش کر سکوں۔ وہ شعراء جن کا شعری سفر طویل ہے، اُن کے ضمن میں میں نے پس کو پیش پر ترجیح دینا مناسب سمجھا اور انتخاب کے معیار کو قائم رکھنے کی غرض سے بعض وہ نظمیں بھی شامل کی ہیں، جو زمان کے اعتبار سے آزادی سے قبل لکھی گئی تھیں۔

نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، موجودہ عہد میں لکھی گئیں قصیدہ نما خطابیہ اور موضوعاتی نظموں یا مثنوی، مسدس و مخمس وغیرہ کے مقررہ سانچوں پر وضع کردہ نظموں کی نسبت میری ترجیح صرف انھیں تجربوں پر ہے جو کسی نہ کسی طور پر اپنے دور کی حسیت کا آئینہ اور احساس کے کسی نئے طرز پر گواہ ہیں وہ شاعری جو محض دماغی ورزش کا نتیجہ اور لفظی بازی گری کا نمونہ ہے، اس انتخاب کی حد سے باہر ہے۔

کسی بھی عہد یا منطقے کے شعراء کے کلام کا انتخاب ایک کٹھی ذمہ داری کا عمل ہے۔ یہ ایک بلند کوشش منصوبہ تھا۔ مجھ ہیچ مدان سے اگر کوئی سہو سرزد ہوا ہو تو درگزر فرمائیں۔ کسی بھی نام کی عدم شمولیت کی ذمہ داری بھی مجھ گنہگار ہی کے سر ہے۔

میں ذاتی طور پر ان تمام شعراء کا تہِ دل سے ممنون ہوں، جنھوں نے جلد یا بدیر میری گزارش پر توجہ دی اور اپنے کلام سے نوازا۔ بعض حضرات نے کئی یاد دہانیوں کے باوجود جواب سے محروم رکھا۔ چوں کہ انھوں نے اجازت نامہ

بھیجنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی، سو بحالتِ مجبوری اُنھیں آخری شمار کے دوران حذف کرنا پڑا جس کا مجھے شدید قلق ہے۔

گرامی قدر شریف الحسن نقوی صاحب، سکریٹری اُردو اکادمی، دہلی کا متشکر ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے بہترین مشوروں سے نوازا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ پروفیسر قمر رئیس، جناب راج نرائن راز اور جناب مخمور سعیدی کا بھی ممنون ہوں۔ جنھوں نے بہر طور میری معاونت و رہنمائی کی۔

عتیق اللہ
استاد: شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

maablib.org

اجمل اجملی

ایک ان کہی نظم

بہت چھوٹی
بہت ہی مختصر اک نظم لکھنے کا ارادہ ہے
مگر اب تک
بیاضِ شاعری کا وہ ورق سادے کا سادہ ہے
جہاں وہ نظم ٹانکی جائے گی
دولہن کے ماتھے پر سجے ٹیکے
انگوٹھی کے نگینے
اور نیلے آسماں پر جگمگاتے چاند کی صورت

بہت چھوٹی
بہت ہی مختصر اک نظم لکھنے کا ارادہ ہے
وہ ہر لمحہ تخیل کی حدوں کے پاس رہتی ہے
کبھی سانسوں میں پلتی ہے
کبھی خوابوں میں بستی ہے
خیالوں میں کبھی پرواز کرتی ہے
کبھی انگڑائیاں لیتی ہے دل کش پیکروں کا روپ بھر بھر کر

کبھی نغموں میں ڈھلتی ہے
مگر پتھر ہی رہتی ہے
کبھی مورت نہیں بنتی
میں اپنی بیٹیوں کا نام لے لے کر اُسے آواز دیتا ہوں
سُنو سیما!
سُنو لونا!
سُنو زویا!
سُنو مالو!
وہ اپنی بانہہ پھیلائے مری جانب لپکتی ہے
مگر پھر لوٹ جاتی ہے
بیاضِ شاعری کا وہ ورق سادہ ہی رہتا ہے
بیاضِ شاعری کا وہ ورق برسوں سے سادہ ہے
بہت چھوٹی
بہت ہی مختصر اک نظم لکھنے کا ارادہ ہے

بہت چھوٹی
بہت ہی مختصر
بس اپنے لفظِ امن کی صورت
مگر ایسی کہ لفظِ امن سے وابستہ ساری وسعت و قوت سمٹ آئے
عقیدہ
آرزو
حسرت
تمنا

جہد کا پرچم
لڑائی کا اُلٹ

مایوسیوں کے ڈھیر میں اُمید کا پہلو
سُلگتی وادیوں میں دور سے آتی ہوئی زیتون کی خوشبو

وہ نعرہ
جنگ کے میدان میں گونجے تو توپوں کے دہانے سرد پڑجائیں
وہ چانٹا
جنگ کے عفریت پر پڑجائے تو آنکھیں نکل آئیں
وہ کانٹا
شیر کے پنجے میں چبھ جائے
تو آدم خور تھر تھر کانپتے کمزور کی جانب لپکنے اور جھپٹنے کی سکت کھودے

وہ سایہ
آگ میں جلتی ہوئی دھرتی پہ چھا جائے تو گلشن لہلہا اُٹھیں
فضائیں گُنگنا اُٹھیں

نہ جانے اس طرح کی نظم کس دن اس قلم کی زد میں آئے گی
نہ جانے کب بیاضِ شاعری کے اس ورق کو جگمگائے گی
بیاضِ شاعری کا جو ورق برسوں سے سادہ ہے
بہت چھوٹی
بہت ہی مختصر اک نظم لکھنے کا ارادہ ہے

نئی نسل

ہم نئی نسل کے مسیح کرام
وقت کی سولیوں پہ لٹکے ہیں
قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے لہو
اس صدی کے گناہ دھوتا ہے
انگلیاں ہیں کہ موم کی شمعیں
فکر کے راستوں پہ روشن ہیں
پل رہا ہے بطونِ حاضر میں
آنے والے سماج کا سورج
اور ہم سب جہانِ تیرہ میں
آخرِ شب کے وہ ستارے ہیں
جن سے خورشید نور پاتا ہے
اک نیا دن جہاں میں آتا ہے

maablib.org

صلیب

زندگی ہر قدم پر صلیبیں لیے منتظر ہے کہ عیسیٰ نفس آئیں گے
اپنے ہاتھوں کا حبس لائیں گے
اپنی باتوں کا رس لائیں گے
اور جذبِ دروں کے یہ دل کش نگینے لیے
عظمتِ زندگی کے خزینے لیے
دل کی قربان گاہِ مقدس پہ قربانیوں کی دلاویز شمعیں جلاتے ہوئے
مسکراتے ہوئے
گنگناتے ہوئے

ہم سے کتنے جواں
کتنے عیسیٰ نفس
ان صلیبوں بھرے راستوں سے گزر جائیں گے
یعنی مر جائیں گے

ہم سے کتنے جواں
کتنے عیسیٰ نفس
ان صلیبوں کی چاہت میں مارے گئے

"دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے"
آئیے ان صلیبوں کو گننے کی جرأت کریں
مفلسی
عشق
درماندگی
حوصلہ
ولولہ
جرأتِ گفتگو
مریمِ آبرو
لیلیٰ آرزو
فکرِ تعمیر و خوابِ نگارِ وطن
زندگی کا چلن
پیٹ۔ ذہن اور کنبے کی آسودگی
کتنے عنوان ہیں
کتنی قربان گاہیں صلیبیں لیے
کتنے جلاد ہاتھوں میں کیلیں لیے
زندگی کی گزرگاہ گھیرے کھڑے
منتظر ہیں کہ عیسیٰ نفس آئیں گے
اپنی باتوں کا رس لائیں گے
اپنے ہاتھوں کا جس لائیں گے

کرشناولی

شام سلونے
گوکل کے گوپال پیارے
رادھا کے من میت
پکاریں سب تم کو جگ جیت
کہاں ہو آؤ
بدل دیں
مل کر جگ کی ریت
رادھا کے من میت
پکاریں سب تم کو جگ جیت

نند گلی کے نٹ کھٹ بالک
سُندر
ماکھن چور
گگری گگری ماکھن چھلکے
سانپ اگورے
چلے نہ اپنا زور

کہاں ہو آؤ
بدل دیں
مل کر جگ کی ریت
رادھا کے من میت
پکاریں سب تم کو جگ جیت

برندابن کے بنسی کنہیا
من موہن
چت چور
بنسی کی میٹھی تانوں پر ناچے من کا مور
باہر ہاہا کار
نفرت کا وِش گھول رہے ہیں کنسوں کے اوتار
بڑھتی جائے ظلم کی بدلی
چھائی گھٹا گھنگھور
چلے نہ اپنا زور
کہاں ہو آؤ
بدل دیں
مل کر جگ کی ریت
رادھا کے من میت
پکاریں سب تم کو جگ جیت

متھرا کے گردھر گوپالا
برندابن میں ہولی کھیلو

برسے گلال عبیر
شیو کی پھلواری دہکے
میلہ ندی نیر
گلی گلی میں ہولی سُلگے
مہکیں محل گھیر
پاپی تولے بھاپ اُڑائیں
جشن منائیں
چھلکے خون کی دھار
بند مکاں میں آگ لگائیں
جسم جلائیں
پھُنک جائیں پریوار
ننھے بالک بھالے کھائیں
پھیکیں نین کے نیر
رادھاؤں کی عزت لوٹیں
دھرم پجاری ویر
لُٹی بجریا کھڑا شدا ما پوچھے تیری راہ
سینوں سے باہر آتے ڈرے دلوں کی آہ
ٹوٹا ٹوٹا سناٹا ہے
سہما سہما شور
ہنسا کی بل کھاتی ناگن لہرائے ہر اور
چلے نہ اپنا زور
کہاں ہو آؤ
بدل دیں مل کر

جگ کی ریت
رادھا کے من میت
گوکل کے گوپال پیارے
میرا کے گھنشیام
رادھا کے من میت
پکاریں سب تم کو جگ جیت

maablib.org

دعا

وقتِ آخر ہے، اے ضمیر مرے
حق پرستی کی شان باقی رکھ
بے محابا زبان باقی رکھ
سر کا جو حشر ہو رہے یا جائے
آبرو پر قلم کی حرف نہ آئے
دل کو احساسِ دردمندی دے
بامِ نیزہ پہ سربلندی دے
داغِ کینہ سے پاک ہو سینہ
مہر سا تابناک ہو سینہ
جامِ نفرت میں ہوش غرق نہ ہو
آدمی آدمی میں فرق نہ ہو
ہوسِ لقمہ ہائے تر نہ رہے
ظلم کا ظالموں کا ڈر نہ رہے
دوستوں سے ملے پیار کی خو
پاس بھٹکے نہ اقتدار کی بو

رشتہ جو سب سے بے گناہی کا
شہریاروں سے کج کلاہی کا
جاہ و حشمت سے بے نیاز بنا
کارپرداز کارساز بنا
کاسہ لیسی گداگری سے بچا
درِ سلطاں پہ حاضری سے بچا
باب سینے کے سارے کھل جائیں
ساری دنیا کے دکھ سمٹ آئیں
عشقِ بے لطف کو رقیب ملے
عیسیٰؑ دور ہوں صلیب ملے
شہرِ دوراں کے رو برو نہ جھکوں
بے گلا پاس تو حسینؑ بنوں
کج پہ جب بھی پڑے کوئی افتاد
ہو ادا قرضِ سنتِ سجّاد
جذب منصور و بایزید ملے
رتبۂ سرمدِ شہید ملے
مصلحت کوشیوں سے بالا رکھ
دل میں جذبات کا اجالا رکھ
مطمئن شادماں، ضمیر مرے
دمِ آخر ہے آبرو رکھنا
بعد والوں سے سرخرو رکھنا

اختر آذری

بحران

میری محبوب! مرے ہوش ٹھکانے ہیں ہنوز
جسم بیمار سہی ذہن تو بیمار نہیں
تیرے چتر کے خداؤں سے مجھے کیا لینا
میری ہستی کسی رحمت کی طلبگار نہیں
کوئی سیلاب بہا کر نہیں لے جا سکتا
کہ، مرا عزم جواں ریت کی دیوار نہیں
سونے چاندی کے کھلونوں سے بہلنے والی
تیری محدود نظر محرم اسرار نہیں
اس طرح تو مجھے مایوس نگاہوں سے نہ دیکھ!
میرے چہرے پہ ابھی موت کے آثار نہیں
مجھے مطلوب نہیں اپنی خودی کی توہین
حُسن پرور ہے، مرا عشق۔ غلط کار نہیں
میرے امروز کی رعنائی کو حاصل ہے دوام
میں کسی وعدۂ فردا کا خریدار نہیں
میں، خود آگاہ اُمیدوں کا جنم داتا ہوں
جانتا ہوں کہ مری کوششیں بےکار نہیں

میری محبوب! مرے ہوش ٹھکانے ہیں ہنوز
مجھے معلوم ہے حالات بدل جائیں گے
• اپنی راہوں میں جو حائل ہیں مصائب کے پہاڑ
میرے انفاس کی گرمی سے پگھل جائیں گے
میرے ادراک کی کرنوں کو دبکھ جانے دے
بجھ چکے ہیں یہ جو دیپک ابھی جل جائیں گے
ابھی موجود ہیں اوہام کے زریں پھندے
ذہن بدلے، تو ارادے بھی بدل جائیں گے
میری محبوب! یہ آفات ہمہ گیر نہیں
اور کچھ دیر میں حالات سنبھل جائیں گے!!

maablib.org

"طلسمِ خواب جو ٹوٹا تو یہ سوال اُٹھا"

کہاں گئے مری آشاؤں کے وہ رنگ محل ؟
کہاں گئی لب و رُخسار کی وہ رنگینی ؟
سُبک خرام وہ ساون کے ملگجے بادل۔
کہاں گئے وہ جلال و جمال کے منظر ؟
وہ جن سے خون میں گرمی تھی زیست میں ہلچل
مری حیات کی تابندگی و رعنائی
عروسِ شام کا ہلکا سا چمپئی آنچل ——
جنھیں تراشا تھا میں نے ٹھٹھرتی راتوں میں
وہ بہکے بہکے نظارے، وہ مہکے مہکے کنول

کہاں گئے وہ مناظر بہار پرورده ؟
وہ دیپ، جو کبھی مندر میں جگمگائے تھے
وہ نقش جن پہ دھنک کا گمان ہوتا تھا
وہ چاند جو مری آنکھوں میں مسکرائے تھے

وہ عکس، جن میں مچلتی تھیں حسن کی کرنیں
وہ آئینے جو مرے ذہن نے بنائے تھے
وہ مسکراتے ہوئے شوخ زعفران کے پھول
وہ جھیل جس میں پری پیکروں کے سائے تھے
طلسمِ خواب جو ٹوٹا تو آشکار ہوا
کہ نیند اچھی تھی، سپنے مگر پرائے تھے

maablib.org

آج کا مورخ

عطا کیا ہے تمہاری محبتوں نے مجھے
وہ غم جو کنجِ خرابات میں نہیں رہتا
مری نگاہ میں وہ حُسن بس چکا ہے کہ جو
بڑوں بڑوں کے خیالات میں نہیں رہتا
رہا ہمیشہ وہ موضوع میرے گیتوں کا
جو حُسن قیدِ حجابات میں نہیں رہتا

وہ حُسن ـــ میرے تخیل میں رسماتا ہے
وہ حُسن ـــ ذہنوں میں جو انقلاب لاتا ہے

ظلمت سے سویرا پھوٹے گا

ظلمت سے سویرا پھوٹے گا، پستی سے ابھارے ابھریں گے
کچھ اور امیدیں ٹوٹیں گی، کچھ اور سہارے ابھریں گے
کشتی کی طلب کیسی ساقی؟ ملاح سے کیا لینا ہے ہمیں
موجوں کے بھروسے ڈوبے ہیں طوفاں کے سہارے ابھریں گے
کچھ اور نگاہیں سنوریں گی، کچھ اور ارادے سلجھیں گے
کچھ اور شعاعیں نکھریں گی، کچھ اور ستارے ابھریں گے
اوقات کی اندھی موجوں نے، شکنوں میں لپیٹا ہے جن کو
گرداب کے غم میں آنچل پر اک دن وہ کنارے ابھریں گے

اِن مردہ روحوں پر صدیوں سے غلامی چھائی ہے
اے دوست! انھیں جھنجھوڑ ذرا یہ لوگ ابھارے ابھریں گے

اندرسروپ دت نادآن

میری آنکھیں

میری اشک آلودہ آنکھیں
چوراہے کا
خونی منظر دیکھ رہی تھیں
اور اس لالہ زار کا ہادی
اپنی روپوشی کی خاطر
میری آنکھوں کو ہتھیانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔۔۔۔

آج میں آنکھیں کھو بیٹھا ہوں
لیکن وہ احساس برابر دیکھ رہا ہے
جو آنکھوں کے زخموں نے بیدار کیا ہے!

maablib.org

چار کندھوں کی جستجو میں

فلک پہ تاروں کی روشنی تھی
زمین وعدوں کی چاندنی میں نہا کے جنت بنی ہوئی تھی
سمے کا جادو عروج پر تھا
نظر نظر میں
بسا ہوا تھا برابری کا حسین چہرہ
نفس نفس سے رواں تھا دریا محبتوں کا

پرانے مجرم
نئی کچہری میں ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے تھے
مگر وہ فتنے
جو اُن کی کہنہ روایتوں سے جُڑے ہوئے تھے
جو اُن کی نس نس میں بس گئے تھے
برابر آواز دے رہے تھے
کہ تم حریفِ برابری ہو
بدل کے رکھ دو سمے کے رُخ کو

ادھر یہ مشکل بنی ہوئی تھی
اُدھر اندھیری زمین پر بے کفن پڑی تھی
اور آدمیت کے چار کندھوں کی جستجو میں
مذاقِ دوراں اُڑا رہی تھی
وہ لاش جس کا قصور یہ تھا
کہ اُس کی مٹی نے اپنی بستی کی اُس گلی میں جنم لیا تھا
کہ جس کے ہر موڑ پر یہ ابر لکھا ہوا تھا
مجھے نہ چھونا....

maablib.org

ٹھی دتّاں

میں نے بھی کچھ اینٹیں چُن کر
اُن پر اپنا نام لکھا ہے
آپ کی دلی سے اب میرا بھی رشتہ ہے
لیکن میرے من کا پنچھی
اِن اینٹوں کے جادُو سے بیگانہ ہو کر
اب تک واگھا پار کی اُس بستی کے چکّر کاٹ رہا ہے
جس کو میرے پُرکھوں نے آباد کیا تھا
جس کو آدھی رات کی آزادی نے مجھ سے چھین لیا تھا!

maablib.org

ایک نظم فردا کے لیے

تُو کہاں سمجھے گا میرا درد پگلے
تُو کہ اُن پیڑوں کے سائے میں ابھی تک جی رہا ہے
جن کا رشتہ ہے ترے پُرکھوں کے لمسِ جاوداں سے
اور میں ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچّے کی صورت
اُن گھنے پیڑوں کی جانب
اشک آلودہ نظر سے تک رہا ہوں
جو مجھے پُرکھوں سے ورثہ میں ملے تھے
جن کے ہر پتّے نے دیکھی تھی مری چڑھتی جوانی
جن کے نیچے بیٹھ کر لکھی تھی میں نے
پیار کی پہلی کہانی
——— جن کے پتوں میں چہکتی زندگی نے
میری مٹھی میں ہزاروں بیج بوئے
اور جب وہ فصل کی صورت میں پھوٹے
تو انھیں کھانے کو دوڑی

ایک ناہنجار آندھی

کیا سُناؤں داستاں
تجھ کو میں اس بیدادگر کی
جس کے ہاتھوں
میرا وہ پندار ٹوٹا
جو مجھے دیرینہ رشتوں نے دیا تھا . . . .
ہو مبارک تجھ کو
ان پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں پیارے
بات لیکن یہ بھی دل پر نقش کر لے
دیر کچھ لگتی نہیں ہے
آندھیوں کا رُخ بدلتے
آکہ وہ تاریک دن آنے سے پہلے
آندھیوں کے دیوتاؤں پر
قیامت بن کے ٹوٹیں !

maablib.org

اگر یہ سچ ہے

یہ راستہ تم نے خود چُنا تھا
تمھیں نے اس کو
نشاطِ گاہِ سفر کہا تھا
یہ بھیڑیے — یہ مہیب اجگر
لہو لہو جو پکارتے ہیں تمھارے قدموں کی چاپ سُن کر
نہ تھے تمھاری نظر سے اوجھل
یہ تیرہ تیرہ اترتے سورج کی جان لیوا تمازتیں جو جلا رہی ہیں بدن تمہارا
تمہاری دانست کی حدوں سے نہیں تھیں باہر
یہ زرد آندھی
جو وقت بے وقت سر اُٹھا کر
تمہارے قدموں کی بے پناہی کو ٹوکتی ہے
صلیب لے کر اٹھی تھی اکثر تمہارے ذہنِ رسا کے اندر
تمہیں خبر تھی
کہ راستے میں ہے ایک وحشی مزاج دریا

جو موج در موج بند کرتا ہے راستہ حسنِ جستجو کا
اور اس پہاڑی پہ بھی برابر تمہاری نظریں جمی ہوئی تھیں
جہاں سے پڑتے ہیں روز و شب اس نشاط گاہِ سفر پہ پتھر
اگر یہ سچ ہے
تو پھر یہ شکوے شکایتیں کیوں
یہ نوحہ خوانی، یہ روح فرسا حکایتیں کیوں
یقین رکھو کہ سینہ کوبی سے راستہ یہ نہیں کٹے گا
نہیں ہے کوئی یہاں جو تم سے شکست کی داستاں سنے گا
اگر سنے گا تو پہلے جی کھول کر ہنسے گا
پھر اپنے انداز میں کہے گا
یہ راستہ تم نے خود چُنا تھا!

باؔنی

معمول

ایک بُڑھیا شب گئے دہلیز پر بیٹھی ہوئی
تک رہی ہے اپنے اکلوتے جواں بچے کی راہ !
سو چکا سارا محلّہ . . . . اور گلی کے موڑ پر
بجھ چکا ہے لیمپ بھی
سرد تاریکی کھڑی ہے . . . . جیسے دیوارِ مہیب !
بوڑھی ماں کے جسم کے اندر مگر
جگمگاتی ہیں ہزاروں مشعلیں !
آنے والا لاکھ بے ہوشی کی حالت میں ہو
لیکن
راستہ گھر کا کبھی بھولا نہیں !

اور بے آہٹ سڑک
جانتی ہے . . . .
کس کے قدموں سے ابھی محروم ہوں !

گزشتہ و گزراں، گزشتہ

کوئی بار بار گزشتگی
کبھی سست پا کہ گریز پا
سوئے رفتگاں
کبھی تیز پا
ابھی ایک لمحہ کہ حال ہے
خبرِ فساد کا
خیر کا
دمِ دوستی کا
غمِ غیر کا
کسی قہر کا
کسی لہر کا
کوئی لطف ہے نہ ملال ہے
یہ متاعِ دید و شنید
جیسے
لہو کی ساری خرید
کوئی سمیٹ لے

یہ طویل عمروں
کے فیصلے
کہ ـــ ثوابِ صدمہ وسال
جیسے
حروف قید توقعات
کے سلسلے
کہ ہے بات بات
میں ذکر جن کا
بہت ضروری
یہ لاکھ قرب
کی ناصبوری
یہ ڈر کہ لمحہ کے ساتھ ہی
کہیں بیت جائیں نہ آپ ہم
کہ یہ آپ ہم، یہ ہمہ بہم
یہ طرح طرح کے
معاہدات شریکِ دم
یہ سفر سفر رہِ خاک و نور
قدم قدم
کبھی اک نگاہ
کہ دیکھتی ہے مقامِ دور
یہ اک چمک
کہ چلی گئی ہے جہت کے پار
جو ٹوٹتی ہے تو بے وقار!

کہیں دُودِ شوق بھی رہ گیا
صفِ رنگِ فکر بھی رہ گئی
کہیں رہ گیا ہے
جلالِ آرزو و طلب
کہیں رہ گئی ہے
قلندری
کہیں رہ گئے ہیں
تمام مرحلے صبح کے
کہیں رہ گئی ہے
سکوتِ شب کی
دعاگری
کہ تمام روشنیاں ہیں رفتہ
تمام اِسم و نشاں
گزشتہ
عظیم لفظ و بیاں
گزشتہ
متاعِ خوش ہنراں
گزشتہ
ردائے رنگ
ادائے عکس
صدائے خلق
نوائے شخص
گزشتہ و گزراں، گزشتہ

کبھی کبھی
یہ خیال آئے
تمام معجزے پیشتر ہو گئے تمام
ہمارے حصے
کی اب نہیں کوئی آبرو
کوئی افتخار، مقام، نام

کبھی، جو لمحۂ قبل کے
کہیں اندروں میں
ذرا سا جھانکیں
تو یوں لگے
کہ گنتیوں کے ساتھ
چلا گیا ہے تمام وقت
بساط ساری بشارتوں کی
الٹ چکی ہے
وہ زندگی ہے
کہ سب کہیں نہ کہیں
نسب سے جڑے ہوئے ہیں
کہ سارے تذکرے
طے شدہ ہیں
گزشتگی سے
وفا کا عہد
ہزار عہد سے ہو رہا ہے

جو ہم سے پہلے گزر چکا ہے
وہی دوبارہ گزر رہا ہے
کہ یہ بار بار کی رفتگی
کبھی سُست پا کہ گریز پا
سوئے رفتگاں
کبھی تیز پا...
ابھی ایک لمحہ کہ حال ہے
کہ بسر شدہ کو
بسر کریں
کہ یہی ہمارا کمال ہے !!

maablib.org

نفی سارے حسابوں کی

لپکتا سُرخ امکاں
جو مجھے آئندہ کی
دہلیز پر لا کر کھڑا کرنے کی خواہش میں
مچلتا ہے
مرے ہاتھوں کو چھو کر
مجھ سے کہتا ہے
تمہاری انگلیوں میں
خون کم کیوں ہے
تمہارے ناخنوں میں
زردیاں کس نے سجائی ہیں
کلائی سے
نکلتی ہڈیوں پر
اُون کم کیوں ہے
میں اُس سے
ناتواں سی اک صدا میں
پوچھتا ہوں

اس سے پہلے تم کہاں تھے...
اس سے پہلے بھی یہی ساری زمینیں تھیں
یہی سب آسماں تھے
اور میری آنکھ میں
نیلے، ہرے کے درمیاں
اک رنگ شاید اور بھی تھا
اب مرے اندر نہ جھانکو
میرے باطن میں مسلسل تیرتی ہے، اونگھتی دنیا سرابوں کی
نفی سارے حسابوں کی!!

maablib.org

اِدھر کی آواز اِس طرف ہے

اُجاڑ سی دھوپ
آدھی ساعت
کہ نامکمل علامتیں
داغ داغ آنکھیں
یہ ٹیلہ ٹیلہ
اُترتی بھیڑیں
کہاں ہے
جو اِن کے ساتھ ہوتا تھا
اِک فرشتہ
کٹی پھٹی زرد
شام سے
کون بڑھ کے پوچھے
کہ ایک اِک برگ
آگہی کا
ہوا کے پیلے
لرزتے ہاتھوں سے گر رہا ہے

تمام موسم بکھر رہا ہے
کہ دھیمے دھیمے سے آتی شب کا
یہ آبی منظر
خنک سا شیشہ
کہ وادی وادی کے درمیاں ہے
اگر اُدھر کی صدا ہے کوئی
تو اُس طرف ہے !
اِدھر کی آواز
اِس طرف ہے !!

maablib.org

بسمل سعیدی

جنگ

جنگ ہے جذبۂ زبوں جنگ ہے رسمِ کشت و خوں
جنگ درندگی کی خو، خوئے درندگی جنوں

جنگ برائے جنگ کا کوئی جواز ہی نہیں
جنگ فسادِ ذہن و فکر، جنگ فتورِ عقل و دیں

جنگ وہ کچھ سہی مگر جنگ ہو ناگزیر اگر
جنگ ہے عینِ عقل و دیں، جنگ سے جب نہ ہو مفر

جنگ کی شرح و بست میں حُسنِ تضاد بھی تو ہے
جنگ فساد ہے اگر، جنگ جہاد بھی تو ہے

قتل کے مسئلے میں اِک نکتۂ خاص بھی تو ہے
قتل حرام ہے اگر، قتل قصاص بھی تو ہے

جنگ برائے جنگ اگر ہو تو وہ جنگ قہر ہے
جنگ برائے امن اگر ہو تو وہ جنگ مہر ہے

کون یہاں ہے جنگجو، کون یہاں ہے جنگ خو
پہلے ہی سرد ہے لہو حُسن کے ذَلَا تُقَاتِلُوا

کس کو خیالِ جنگ تھا، کس کو جنونِ جنگ ہے
ہاں مگر اب سکوت بھی موجبِ عار و ننگ ہے

اَب کہ وطن اور آبرو، اب کہ چمن یہ رنگ و بو
اب کہ تمام کاخ و کو، اَب کہ من و شما و تو

خطرۂ بے پناہ میں خطرۂ بے اماں میں ہیں
خطرۂ بے اماں میں ہیں، نرغۂ دشمناں میں ہیں

اب کہ عدوئے جابر و جابرِ پُرجفا و جور
ہم سے برت رہا ہے اور حیلہ و مکر و فن کے طور

اَلحذر التوائے جنگ، رجعتِ فوج اَلحفیظ
زیرِ سکوتِ سطحِ بحر شدتِ موج اَلحفیظ

جذبۂ مہر دل میں اب آتشِ سنگ کیوں نہ ہو
نغمۂ سازِ امن اب نعرۂ جنگ کیوں نہ ہو

جنگ سے خود ہی کھل گیا عُقدۂ رازِ جنگ و قتل
وقت سے ہم کو مل گیا حکمِ جوازِ جنگ و قتل

اب کہ وطن کے واسطے ہم پر جہاد فرض ہے
جانِ وطن کی ہے یہ جان ہم پہ وطن کا قرض ہے

موت ہے لازمی تو پھر کوئی شہید کیوں نہ ہو
نوحۂ مرگ کی صدا نغمۂ عید کیوں نہ ہو

ہم کہ ہیں آفتابِ صبح گرم مزاج و نرم خو
آگ میں سوز جس طرح پھول میں جس طرح کہ بو

آبِ رواں بھی ہیں ہمیں تیغِ رواں بھی ہیں ہمیں
ابرِ بہار بھی ہمیں برقِ جہاں بھی ہیں ہمیں

نہر بھی مہر بھی ہمیں صور بھی چنگ بھی ہمیں
موم بھی سنگ بھی ہمیں صلح بھی جنگ بھی ہمیں

ہم سے کوئی ملے تو ہم، مہر و محبت تمام
ہم سے کوئی لڑے تو ہم، زہرِ ہلاکت دوام

چوری

شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

بن کر نشاط، روحِ محزوں پہ چھا رہا ہے
روحِ طرب کی صورت غم میں سما رہا ہے
اشکوں میں مسکرا کر آہوں میں گا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

بے سمت و بے جہت اک عالمِ بے خبر میں ہوں
اک سحر اک فضائے مبہم ہے اور میں ہوں
جیسے بغیر بھولے کچھ یاد آ رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

راتوں کو نیند بن کر چھپتا ہوا نظر سے
دل میں مرے سمانے آنکھوں کی رہگزر سے
مجھ کو سُلا سُلا کر خوابوں میں آ رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

مجبورِ شرم و شوقِ اُلفت مرے لیے ہے
جرأت فزائے دستِ حسرت مرے لیے ہے
آنچل سے منہ چھپائے دامن بڑھا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

تیرے تصوروں کا منہ پر نقاب ڈالے
جیسے کسی کے پیچھے خود کو کوئی چھپا لے
اس طرح اپنی صورت تیری بنا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

جس طرح دوست گزرے بیگانہ وار کوئی
اور پھر اُسے پکارے بے اختیار کوئی
میرے قریب ہو کر اس طرح جا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

میری طرف تو جیسے لوٹا چکا ہو مجھ کو
برگشتہ کر رہا ہو تیری طرف سے اب تو
اس طرح اپنی جانب مجھ کو بُلا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

چھیڑا ہے سازِ ماہِ کامل فلک پہ جا کر
مسحور کر رہا ہے کرنوں کی لے میں گا کر
بے صوت و بے صدا اک نغمہ سنا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

بے التفاتیوں کا جس میں ہے طنز پنہاں
جس میں مفارقت کا ہرگز نہیں ہے امکاں
وہ مژدۂ وصالِ پیہم سُنا رہا ہے
شاید تری محبت کوئی چُرا رہا ہے

شاعر

میں شاعر ہوں زمانہ سے جُدا انداز ہے میرا
ٹھکانہ ہے کوئی اِس مدّ و جزرِ ذہنِ شاعر کا
دل ہر حرف سے معنی کی لَے ایسی اُبھرتی ہے
کبھی قلبِ مشیت میں مثالِ راز رہتا ہوں
قلمرو میں مری تغیرِ ہستی اک بہانہ ہے
کیا دریوزۂ درگاہِ مفلس میں نے تاروں کو
کبھی عشرت گہہ تخیل، اندوہ جہنم ہے
کبھی میں حُسن کی اک جنبشِ ابرو پہ مرتا ہوں
کبھی بلبل کو گل اور گل کو بلبل کر دیا میں نے
سرِ بزمِ تخیل سوچتا رہتا ہوں اکثر میں
کبھی یوں حُسن کو میں مبتلائے رشک کرتا ہوں
خودی کو آرزو مندی کی، جب گرما دیا میں نے
غرورِ حُسن کو مامور کر دیتا ہوں سجدوں پر
نظر جب جانبِ عجز و نیازِ عشق جاتی ہے

دو عالم سے الگ اک عالمِ پرواز ہے میرا
کبھی دنیا مری عقبیٰ، کبھی عقبیٰ مری دنیا
صریرِ خامۂ شاعر پہ فطرت رقص کرتی ہے
کبھی ذہنِ مشیت میں خلل انداز رہتا ہوں
فسانہ بھی حقیقت ہے، حقیقت بھی فسانہ ہے
سرابِ دشت کر ڈالا ہے اکثر میں نے جیحوں کو
کبھی فردوس میری فکر کی جولان گہہ غم ہے
کبھی میں دشنۂ نازِ عشق سے ہنس کر گزرتا ہوں
نیاز و ناز کی ہر شمع کو گل کر دیا میں نے
جلا دوں شمع کو سوزِ دلِ پروانہ دے کر میں
ہر اک جنبش کو چشمِ سرمہ سا کی اشک کرتا ہوں
نیازِ عشق و نازِ حسن کو ٹھکرا دیا میں نے
جبینِ ناز کو مجبور کر دیتا ہوں سجدوں پر
نگاہِ ناز بھی عشوہ طرازی بھول جاتی ہے

مری افکاری سے عشق کو اندازِ عشق کے
خمِ گیسو و زلفِ عنبریں میں حُسن ہے میرا
بہ ہر چشمِ فسوں گر غمزۂ غمّاز ہے میرا
سمجھتا ہوں بساطِ نخوت و اندازِ محبوبی
یہ اندازِ نیاز اس عشق کو میں نے بتایا ہے

وقارِ حُسن کی چتون کے بل میں نے نکلوائے
کمانِ ابرو و چینِ جبیں میں حُسن ہے میرا
ہر اک اندازِ معشوقانہ میں انداز ہے میرا
مری نظروں میں ہے اندازۂ ہر نازِ محبوبی
مجھی سے حُسن میں پندارِ محبوبانہ آیا ہے

سکھایا عشق کو میں نے حریفِ ناز ہو جانا
مگر پھر فتح مندانہ سپر انداز ہو جانا

بلراج کومل

اکیلی

اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا
جانتی ہوں تمہارے لیے غیر ہوں
پھر بھی ٹھہرو ذرا
سُنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسّم فغاں

آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
میری امّی نہیں
میرے ابّا نہیں
میری آپا نہیں
میرے ننھے سے معصوم بھیّا نہیں
میری عصمت کی مغرور کرنیں نہیں
وہ گھروندا نہیں جس کے سائے تلے
لوریوں کے ترنّم کو سنتی رہی

پھول چُنتی رہی
گیت گاتی رہی
مسکراتی رہی
آج کچھ بھی نہیں
آج کچھ بھی نہیں

میری نظروں کے سہمے ہوئے آئینے
میری امی کے، ابا کے، آپا کے اور میرے ننھے سے معصوم بھیا کے خوں سے
ہیں دہشت زدہ

آج میری نگاہوں کی ویرانیاں چند مجروح یادوں سے آباد ہیں
آج میری اُمنگوں کے سوکھے کنول میرے اشکوں کے پانی سے شاداب ہیں
آج میری تڑپتی ہوئی سسکیاں ایک سازِ شکستہ کی فریاد ہیں
اور کچھ بھی نہیں
بھوک مٹتی نہیں
تن پہ کپڑا نہیں
آس معدوم ہے
آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا
سُنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
سُنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو، یہ مجسّم فغاں
میری امی بنو

میرے ابا بنو
میری آپا بنو
میرے ننھے سے معصوم بھیّا بنو
میری عصمت کی مغرور کرنیں بنو
میرے کچھ تو بنو
میرے کچھ تو بنو
میرے کچھ تو بنو

maablib.org

ایمبولنس

جو مجھ کو لائی تھی سکون گاہ میں
وہ ایک تھی
سپید، صرف ایک، اس کے پہلوؤں، جبین اور پشت پر
صلیب کے نشان تھے

میں مجبور خوار اک عظیم گھاؤ تھا
وہ مجھ کو دست مہرباں میں سونپ کر
چلی گئی تو میں غنودگی کی بے کراں مہیب دُھند میں بھٹک گیا
ہر ایک رہ گزر پہ گاڑیوں، بسوں کا کارواں امنڈ پڑا
عجیب انقلاب تھا مری نظر کے سامنے
وہ ایک پل میں سب سپید ہو گئیں
سپید سب سپید، ان کے پہلوؤں، جبین اور پشت پر
صلیب کے نشان دفعتاً ابھر کے آگئے
الم نصیب ان کے بے اماں مکیں
مرے ہی ہم نفس، وفا شعار زندہ عزیز تھے
جو سادگی سے کوئی مشتہر فریب کھا گئے
کسی مہیب جنگ بھوک قحط یا وبا کی زد میں آگئے !

صبا کے ہاتھ پیلے ہوگئے

صبا کے ہاتھ پیلے ہو گئے
میں ساعت سرشار میں
لاکھوں دعائیں
خوبصورت آرزوئیں
پیش کرتا ہوں

صبا ممنون ہے
لیکن زباں سے
کچھ نہیں کہتی

صبا اب روز و شب
دیوار و در تن پر سجاتی ہے
اب آنچل چھت کا سر پر اوڑھتی ہے
لمسِ فرشِ مرمریں سے
پاؤں کی تزئین کرتی ہے

وہ کہساروں شگفتہ وادیوں جھرنوں
چمکتے، نیلگوں آکاش کے
نغمے نہیں گاتی
صبا اب لالہ و گل کی طرف شاید نہیں آتی
صبا شبنم ادا، تصویر پابستہ
در روزن میں آویزاں
حسین نازک بدن
روشن، منور ساحلوں پر اب نہیں بہتی
صبا لب کھولتی ہے، مسکراتی ہے
صبا سرگوشیوں میں
اب کسی سے کچھ نہیں کہتی

ننھا شہ سوار

شہ سوار
ننھا منا شہ سوار
ایستادہ ہے
خمیدہ پشت پر میری
جونہی رُکتا ہوں
وہ ترغیب دیتا ہے
مجھے چلنے کی
آوازوں کی سرگم سے
میں چلتا ہوں
میں واماندہ قدم چلتا ہوں
وہ مہمیز کی جنبش سے کہتا ہے کہ دوڑو
اور دوڑو، تیز تر، سرپٹ چلو
بادِ نغمہ کار سے باتیں کرو
اس کا میں رخشِ رضا
تیز تر کرتا ہوں رفتارِ خرام
مجھ کو پہنچانا ہے آج

اس کورنگوں، تتلیوں کے دیس میں
جادو نگر میں
میرے سائے کا بھی اب شاید جہاں
منتظر کوئی نہیں

منتظر ہیں اس کے لیکن، میرے ننھے دوست کے
دیو قامت، سبز وارفتہ وقار
دُور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے اشجار
رقصِ برگ و بار

جا رہا ہے خواب کی رفتار سے
دیوانہ وار

میرا ننھا شہ سوار

شاید

کچھ لوگ

جو میرے دل کو اچھے لگتے تھے
عمروں کے ریلے میں آئے
اور جا بھی چکے

کچھ دھندوں میں مصروف ہوئے
کچھ جو ہا دوڑ میں جیت گئے
کچھ ہار گئے
کچھ قتل ہوئے
کچھ بڑھتی بھیڑ میں
اپنے آپ سے دور ہوئے
کچھ ٹوٹ گئے کچھ ڈوب گئے

مجھ پر یہ خوف اب چھایا ہے
میں کس سے ملنے جاؤں گا
میں کس کو پاس بلاؤں گا

آندھی ہے گرم ہوا ہے، آگ برستی ہے
کچھ دیر ہوئی
اک صورت، شبنم سی صورت
اس تپتی راہ سے گزری تھی
دو پنچھی پیڑ کے پتوں میں چھپ کر بیٹھے تھے
ہنستے، شور مچاتے تھے
اک دوست پُرانا
برسوں بعد ملا مجھ کو
اس چلتے دن کی
صبح کچھ ایسی روشن تھی
جب بادِ صبا، وارفتہ رو
خوشبوؤں، نغموں، ننھی منی باتوں کا
انداز لیے آنگن میں چلی

میں زندہ ہوں

یہ سوچ کے خوش ہو جاتا ہوں
وہ تھوڑی دیر تو میرے پاس سے گزری تھی
وہ میرے دل میں اتری تھی
اس بے محرم سے موسم میں
شاید وہ کل بھی آئے گی
شاید وہ کل بھی میری راہ سے گزرے گی

تاجور سامری

خوش بختی

بس اب رُک جا رکشا والے! میری منزل آپہنچی
یہ لے اپنی مزدوری ــــ بس کافی ہے نا ــ؟
بابوجی ؟ ؟
دن بھر خون پسینہ اِک کر کے پاؤں چھ آنے ہیں؟
کیوں بے! چھ آنے کیا کم ہیں' اور کیا ہاتھی کھلوادوں؟
پرداتا! کچھ دیا کے کرو' یہ مزدوری میں کیوں کرلوں؟؟
پانچ جنوں کا ملک چاہے' پیٹ مجھے بھی بھرنا ہے...
کیا بکتا ہے! لمبا ہو ـــــ مجھ کو کچھ اور بھی کرنا ہے
بابوجی! ؟؟.....
اے جا بھی مچک! ـــــ ورنہ چالان کرا دوں گا
داروغہ' ڈپٹی سب اپنے ہیں' سالے! پھنسوا دوں گا
مجھ سے جو کچھ بھی ملتا ہے بس تو جان! غنیمت ہے
میں تیری رکشا پر تھا' سمجھے تو بڑا خوش قسمت ہے
میں!! جو کونسل کا ممبر ہوں' تاجر بھی' مل اونر بھی
دھرم کا سچا سیوک بھی ہوں! اور جنتا کا لیڈر بھی

سفید بال

مرے رفیق تو مرے سفید بال دیکھ کے
بجھی بجھی نظر کی جوت خشک کھال دیکھ کے
سمجھ رہا ہے ایک سن رسیدہ آدمی مجھے
اسی لیے تو دے رہا ہے بھیک رحم کی مجھے
مگر یہ عمر کے نہیں نشاں ہیں ظلم و جور کے
مہاجنی نظام کے تباہ کار دور کے
مری طرح نہ جانے کتنے ہیں؟ کوئی نہ گن سکا
سمے سے پہلے ہی بڑھاپے نے جنھیں دبا لیا
اجارہ داریوں کا یہ نظام اک وبال ہے
مزے میں چند لوگ اک جہاں خراب حال ہے
بنا دیا ہے آدمی کو وحشی اس نظام نے
مٹائیں آدمیتیں دکھوں کے اژدہام نے
پڑا ہے قحط دیس دیس زندگی بجھی ہوئی
محبتوں جوانیوں پہ اوس سی پڑی ہوئی

تباہ حال لوگ مر رہے ہیں راہ باٹ میں
پڑے ہیں مست رام راج والے راج پاٹ میں

سمے کی باگ دھن کبیر جی کے ہاتھ آگئی
تجارتوں پہ ڈالروں کی اک گھٹا سی چھا گئی

تجوریوں میں رونقیں بلیک میں ہجوم ہے
تباہیوں خرابیوں کی چار کھونٹ دھوم ہے

نہ محنتی کو کام ہے نہ کھیت ہے کسان کو
دبوچتی ہے اب تو جیل لام ہر جوان کو

اُجاڑ کھیت کانوں جنگلوں کو چُپ لگی ہوئی
ملوں کی ہر مشین جنگ جنگ چیختی ہوئی

ہجوم بھک مروں کے بھر رہے ہیں شہر میں
نظر نہیں کبھی کٹار ہے اُبلتے زہر میں

ہواؤں پانیوں پہ موت بھاگ کھیلتی ہوئی
اداسیوں کی باڑھ زندگی کو ریلتی ہوئی

گھروں میں بین جیلوں میں ہیں نغمے انقلاب کے
اُگے ہیں بھوک کی کھیتوں میں شعلے انقلاب کے

وہ نقطہ آگیا ہے اے رفیق وقت کے لیے
ڈسیں گے کالی رات کو لپک کے جب بجھے دیئے

کہ تیور اب بدلتے دیکھتا ہوں میں عوام کے
وہ دیکھ کانپنے لگے ستون اِس نظام کے

اُٹھے کسان اور کامگار دھوم دھام سے
چڑھے ہیں لوگ باگ دفتروں گھروں کے کام سے

تباہیوں کے جنگلوں سے زندگی کو چھیننے
سیاہیوں کے دامنوں سے روشنی کو چھیننے
وہ روشنی جو دائمی بہار لے کے آئے گی
خزاں کی سرد مہریوں کی تیرگی اڑائے گی
بجھے ہوئے اُداس دل نئی اُمنگ پائیں گے
سفید بال زندگی سے ایک رنگ پائیں گے

maablib.org

رات مر رہی ہے

میں کب تک اپنے ہی دُکھ کے گیت اپنے خول میں رہ کے گنگناؤں؟
جمود ہے اِک جہاں پہ طاری، میں کیوں نہ ایسے میں باہر آؤں؟
غرض کے بندوں نے زندگانی کو ایک مرگھٹ بنا دیا ہے
اسنکھ لوگوں کو کیچڑوں کا ذلیل جیون عطا کیا ہے
میں اپنا فرض آج بھی نہ جانوں؟
کھڑی ہے سچائی میرے آگے۔ میں اب اسے کس طرح نہ مانوں؟
کہ ساری انسانیت کے سُکھ ہی میں میرا سُکھ ہے
یہ زندگی کا ایم دُکھ میرا اپنا دُکھ ہے۔
یہاں ضرورت ہے روشنی کی
وفا کی ایثار و ہمدمی کی
میں اس جگہ تو ضرور گاؤں گا دائمی سرخوشی کا نغمہ
اُمید کا، زندگی کا نغمہ
میں گاؤں گا ایسے گیت کو دے اُٹھیں گے سائے
میں گاؤں گا وہ ترانہ جس کو تمام سنسار گنگنائے
بڑے زمانے سے آدمی ایک ایسا دیپک ہے جس پہ لو مسکرا نہ پائی
کراہوں، آہوں نے مسخ کر دی ہے اس کے جیون کی خوشنمائی

سُنائے جاتے ہیں ہر گھڑی اس کو غم کے مایوسیوں کے قِصّے
بجائے جاتے ہیں اس کے ہر سُو الم کے باجے دُکھوں کے نغمے
یہ آدمیت کا نقطہ گہنا گیا! تو پر لے مچے گی ہر سُو
اُجاڑ دھرتی، اُداس ویرانیوں کو دیکھا کرے گی ہر سُو
نہیں، نہیں یہ نہ ہو سکے گا۔ میں گاؤں گا روشنی کے نغمے
اُمید کے، زندگی کے نغمے
غرض زدہ لوگ مشعلیں کیوں بجھا رہے ہیں؟
یہ کیسا اُودھم مچا رہے ہیں؟؟
"کہ زندگی مرچکی، اندھیرا جواں ہوا ہے
دبے رہو، اے ذلیل کیڑو، یہی تمہارے لیے سزا ہے"
نہیں نہیں، اے اسنکھ دُکھیو! یہ شور تو کھوکھلا ہے یکسر
ہوا کے جھونکوں سے سچ کا سورج بجھے گا کیوں کر
حقیقتاً رات مر رہی ہے
اُفق پہ ہنگامِ زندگی ہے کہ صبحِ صادق ابھر رہی ہے

مطالبہ

مندر کے فانوس گُل ہو چکے ہیں
نغمہ کہاں کا؟
طاؤس چُپ ہے
خاموشیوں میں
ناقوس چُپ ہے
نغمے ترانے سب کھو چکے ہیں

ہر سو خموشی ہر سمت ظلمت
اے میرے طالب!
اے میرے پیارے!
میں آگیا ہوں
اب تیرے دوارے
پوری ہوئی ہے تیری عبادت

تو نے یہ مجھ سے وعدہ کیا تھا
جب آؤ گے تم
میں نذر دوں گا

سارے جہاں کا
انمول تحفہ
میں نے یہ تجھ سے وعدہ لیا تھا

لا اب کہاں ہے؟ نذرانہ میرا
لیکن تعجب!
یہ پھول کلیاں!
یہ ہیرے موتی!
یہ مشک و لوبان!
کیا مدعا ہے؟ ان سب سے تیرا

سمجھا میں سمجھا اب یہ معمّا
یہ تیرے چاول
یہ مشک و لوبان
یہ ہیرے موتی
یہ پھول کلیاں
تیری نظر میں ہیں سب سے اعلیٰ

لیکن سمجھ رکھ اے میرے پیارے!
یہ تیرے تحفے
گو بہترین ہیں
لیکن مجھے یہ
جچتے نہیں ہیں

مجھ کو تو لا دے انمول تارے

اے میرے طالب دے نذر مجھ کو
اشکوں کے موتی
داغوں کی کلیاں
حُسنِ ارادت
شوقِ فراواں
اے میرے پیارے دے نذر مجھ کو
اُلفت کے لائق تحفہ یہی ہے
باقی یہی ہے زندہ یہی ہے

maablib.org

موڑ پر

میں ابھی پہنچا ہوں آخر آج اُن بلندیوں پر
جنھیں میں اپنی پہنچ سے اوپر سمجھ چکا تھا　　سہانے سپنے کا ایک منظر سمجھ چکا تھا
مگر وہ ساری حقیقتیں آج سامنے ہیں　　جنھیں میں امکان ہی سے باہر سمجھ چکا تھا
ہے اک سہانے سکوں کا راج اُن بلندیوں پر

نہایت اونچا پہاڑ قدموں تلے ہے میرے
بلندیاں ہار کر مرے پاؤں میں پڑی ہیں　　زمانے کی وسعتیں مرے سامنے کھڑی ہیں
میں اتنا اونچا ہوں چاہوں تو آسماں کو چھو لوں　　یہ چاند تارے بھی میری مٹھی میں اس گھڑی ہیں
ہر ایک مشکل کا حشر تو سامنے ہے میرے

فضا میں لہرا رہے ہیں دھندلاہٹوں کے آنچل
سرور نے مری روح کو جگمگا دیا ہے　　تمام دنیا کو خوبصورت بنا دیا ہے
پہاڑ پر ہوں کہ موگ کے باغ میں کھڑا ہوں　　شفق ہے یا گل رخوں نے جمگھٹ لگا دیا ہے
مرے قدم لینے کو چلے آ رہے ہیں بادل

مجھے اب اپنے وہ مہرباں یاد آ رہے ہیں
وہ ناامیدی کے قلعے وہ کوہسارِ غم کے — جو مجھ سے میرے سفر میں ہر ہر قدم پہ اُلجھے
وہ چوٹیاں جن کی سربلندی نے مجھ کو گھورا — کھڑا ہوں آج اُن کو اپنے قدموں تلے دبا کے
وہ تند سانپوں کی طرح اب سٹ پٹا رہے ہیں

فضول ہے اب تو اُن کا یہ پیچ و تاب کھانا
کہ میں وہاں ہوں جہاں کوئی کیا پہنچ سکے گا — خیال بھی تو یہاں نہ اُن کا پہنچ سکے گا
میں اس گھڑی ہر خطر سے ہر فکر سے بری ہوں — مرا قدم اب جہاں بھی چاہا پہنچ سکے گا
کیے ہے آغوش وا مرے واسطے زمانا

maablib.org

تلوک چند محروم

نورجہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے　　کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورجہاں ہے
مدت ہوئی، وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے　　اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

اے حُسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے؟　　کس باغ کے گُل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے؟
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟　　ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے!
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے　　غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی، نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے　　دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی!

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر، یہ اندھیر!　　یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر، یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر!　　اے گردشِ ایام! یہ اندھیر، یہ اندھیر!
ماہِ فلکِ حُسن کو یہ برج ملا ہے!
اے چرخ ترے حُسنِ نوازش کا گلا ہے!

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا — ہوتا ہے اثر دل پہ اِن آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا — اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرربار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے موج کا نظارا!

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر — آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر — اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں محفلِ جاناں نہ کسی کی
آباد ہے گورِ غریباں نہ کسی کی!

آراستہ جن کے لیے گلزار و چمن تھے — جو نازکی میں داغ دہ برگِ سمن تھے
جو گُل رخ و گُل پیرہن و غنچہ دہن تھے — شاداب گُلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ و گُل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے!

رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے — جو پیکرِ ہستی کے لیے روحِ رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے — تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجرے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دُنیا کا یہ انجام ہے، دیکھ اے دلِ ناداں! — ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر، نہ ایواں — آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے!

mooblib.org

آفتاب

اے شمعِ دل فروزِ شبستانِ کائنات
تیری کرن کرن ہے رگِ جانِ کائنات
تو مرکزِ ثبات ہے دورِ حیات کا
ہے تجھ سے اہتمام دوروزہ ثبات کا
سرچشمہ زندگی کا ہے، دریا ہے نور کا
مقصد بہت وسیع ہے تیرے ظہور کا
ہنگامہ زندگی کا ترے دم سے گرم ہے
یہ بزم تیری تابشِ پیہم سے گرم ہے
تو رہروِ بقا کے لیے شمعِ راہ ہے
تیرا وجود حُسنِ ازل پر گواہ ہے
ہرجائی گرچہ حُسنِ فسوں کار ہے ترا
تیرا فروغ پردۂ رخسار ہے ترا
جلووں کا تیرے جال ہے ہر سُو بچھا ہوا
اور حُسن ہے زوال سے نا آشنا ترا
کیوں دامِ حُسن میں نہ گرفتار ہو کوئی
بے جا نہیں جو تیرا پرستار ہو کوئی

گر تو نہ ہو تو آتش و آب و ہوا کہاں
اور خاکِ مُردہ میں اثرِ کیمیا کہاں
تیرے ہی فیض سے یہ زر و سیم اگلتی ہے
تیرے کرم سے پھولتی ہے اور پھلتی ہے
ذوقِ نظر ہو اور نہ نظر ہو جو تو نہ ہو
گلشن میں پھول پھولوں میں رنگ اور بو نہ ہو
تیری نگاہ خالقِ ابرِ بہار ہے
تیری تپش سے داغِ لالہ زار ہے
نرگس ترے اشارے پہ کرتی ہے چشم وا
شبنم ترے نظارے پہ کرتی ہے جاں فدا
آنکھوں سے تو ہے گرچہ شبِ تار میں نہاں
ہے تجھ بغیر کون کواکب میں ضوفشاں
تو جلوہ ریز شعلہ و برق و شرار میں
لَو تجھ سے ہے چراغ کی شب ہائے تار میں
ممنونِ ضو اگر ہے فلک پر قمر ترا
پنہاں ہے سنگِ تیرہ کے دل میں شرر ترا
چاہے تو خار کو گلِ خنداں بنائے تو
خارا کو رشکِ لعلِ بدخشاں بنائے تو
ہے فیضِ تربیت کا ترے طرفہ ماجرا
کولا ہو لعل، قطرہ ہو دُرِ گراں بہا
تیرا ہے وہ عتاب، قیامت کہیں جسے
اور لطف وہ کہ نکہتِ جنت کہیں جسے

صحرا کی وہ سمومِ جگر سوز، جاں گزا
وقتِ عتاب ہے نفسِ آتشیں ترا
فصلِ بہار، جس سے نہیں ہے لطیف شے
تیری نسیمِ لطف کی موجِ لطیف ہے
گزری ہے شب، جہاں کو ترا انتظار ہے
ہر ذرہ جستجو میں تری بے قرار ہے
مُرغانِ صبح خیز کی مشرق پہ ہے نظر
ہیں راہ دیکھتے تری واماندۂ سفر
چڑیوں کے دل میں پھر ہے چہکنے کی آرزو
کلیاں لیے ہوئے ہیں چٹکنے کی آرزو
چُپ چاپ برہمن لبِ دریا ہے منتظر
پہلی کرن کی چشمِ تماشا ہے منتظر
پھر محوِ سجدہ ہونے کو ہر موجِ گنگ اُٹھی
دنیا نشاطِ کار کی لے کر اُمنگ اُٹھی
ایسے میں یوں نہ ہو کہ کہیں رُوٹھ جائے تو
اور اپنی بزمِ ناز سے باہر نہ آئے تو!

madlib.org

گوشۂ تنہائی

دنیا میں بہت دوڑے — راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت — تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی!

بچہ نہیں دل، جس کو — لے جایئے میلوں میں
جز تیرے کہاں راحت — دنیا کے جھمیلوں میں
اے گوشۂ تنہائی!

خلوت وہ تری جس میں — ہنگامۂ جلوت ہے
وحدت کا تری غنچہ — اک گلشنِ کثرت ہے
اے گوشۂ تنہائی!

سب عیب و ہنر اپنے — اے آئینۂ باطن
تجھ بن نظر آجائیں — یہ بات کہاں ممکن
اے گوشۂ تنہائی

آزار سے بالا ہے — گو زیرِ زمیں ہے تو
اربابِ قناعت کو — فردوسِ بریں ہے تو
اے گوشۂ تنہائی!

جنگل میں، پہاڑوں میں — تاریک گپھاؤں میں
مرغوب تریں ہے یا — اشجار کی چھاؤں میں
اے گوشۂ تنہائی!

پاتے ہیں جہاں تجھ کو دنیا میں ترے شیدا
فی الفور وہیں اُن کے دُکھ درد ہیں ناپیدا
اے گوشۂ تنہائی!

شاعر کہ مصوّر ہے فطرت کے نظاروں کا
ذرّوں میں ترے اس کو جلوہ ہے ستاروں کا
اے گوشۂ تنہائی!

تو مسکنِ دل کش ہے جویائے حقیقت کا
مرکز ہے حقیقت میں پہنائے حقیقت کا
اے گوشۂ تنہائی!

بازارِ دو عالم میں جو جنس نہیں ملتی
حیرت ہے کہ انساں کو اگر ہے یہیں ملتی
اے گوشۂ تنہائی!

دنیا میں اگر کوئی منزل گہِ عقبیٰ ہے
وہ تیری ہی محفل ہے وہ تیرا ہی ملجا ہے
اے گوشۂ تنہائی

ہر ایک تگ و دو کی ہے آخرِ کار آخر
گر تجھ سے یہاں بھاگے ہے گنجِ مزار آخر
اے گوشۂ تنہائی

خواہاں ہے دل و جاں سے محروم حزیں تیرا
کاش! اس کو دلِ ناداں ہونے دے مکیں تیرا
اے گوشۂ تنہائی!

لوٹ چلیے

سوختہ جاں، سوختہ دل
سوختہ روحوں کے گھر میں
راکھ، گردِ آتشیں، شعلوں کے سایے
نقش ہیں دیواروں پر مفروق چہرے
لوٹ چلیے اپنے سب ارمان لے کر

جھوٹ ہے گزرا زمانہ
اور کسی اُجڑے قبیلے کی بھٹکتی روح شاید
اپنے مستقبل کا دھندلا سا تصوّر
بحرِ غم کے درمیاں ہے
ایک کالے کوہ کی مانند یہ امروز اپنا
کوہ، جس پر رقص کرتے ہیں ستم خوردہ تمناؤں کے آسیب
لوٹ چلیے
اپنے سب ارمان لے کر

سوچیے تو
یوں محبت آتش کدوں میں کیوں جلیں دل
کیوں رہیں ہر وقت سینوں پر چٹانیں
دیکھیے تو
چند لقمے، کچھ کتابیں
ایک بستر، ایک عورت
اور کرائے کا یہ خالی تنگ کمرا
آج اپنی زیست کا مرکز ہیں، لیکن
تیرگی کا غم انھیں بھی کھا رہا ہے
چار جانب زہر پھیلا جا رہا ہے
لوٹ چلیے
اپنے سب ارمان لے کر
اپنے سب پیمان لے کر
جسم لے کر، جان لے کر

maablib.org

نیند کے تعاقب میں

نیند کے تعاقب میں
دُور دُور تک لاحاصل
دیر سے بھٹکتا ہوں
نیلی آنکھوں والی
جنگلی بِلّی

بار بار دُم ہلاتی ہے
میری چارپائی کے نیچے
نیم روشن لیمپ کے اردگرد
کیڑوں پر جھپٹتی ــــ چھپکلی
بے خبر ہے اپنے انت سے
کتنا غیر متوقع ہو گا
رل جانا انت سے

مٹی کے تیل کی گندھ
قلانچیں بھر رہی ہے کمرے میں
بے لگام گھوڑی کی طرح

چھت پر
رینگتی ہوئی خاموشی

بار بار دہرا رہی ہے
پاپی نشاچروں کا گیت

اور نیند میلوں دور
کسی نامعلوم درخت کے پتّوں میں چھپی
چڑیوں سا چہچہا رہی ہے
مجھے بلا رہی ہے ——————

maablib.org

قطرہ قطرہ احساس

پھیل کر پھر شبِ تاریک ہوئی بحرِ سیاہ
قطرہ قطرہ لبِ تنہائی سے ٹپکے احساس
اور پلکوں کی صلیبوں پہ وہ گزرے ہوئے دن
جیسے کھنڈروں کی فصیلوں پہ ٹنگا ہو اتہاس

دفن ہے راکھ کے انبار تلے عزم کی لاش
جستجو اس کی کرے آج کسے فرصت ہے
روشنی مانگ نہ سورج سے، نہ ستاروں سے
تیرہ و تار مکانوں میں بڑی راحت ہے

اب تو الفاظ کے چہروں کی خراشیں پڑھ کر
وقت کو ٹال دیا جائے گداگر کی طرح
ورنہ وہ لمس جو شبنم سے سُبک تر تھا کبھی
آج پھر سینے پہ گر جائے کا پتھر کی طرح

سمندر کا سکوت

آج پھر گھات میں بیٹھا ہے سمندر کا سکوت
ہم کو اک دوسرے سے دور ہی رہنا ہوگا
ہم کو ہر حال میں مجبور ہی رہنا ہوگا

مجھ کو اس دورِ جراحت سے گزر جانے دے
مجھ کو جینے کی تمنا نہیں مر جانے دے
میری تقدیر میں غم ہیں تو کوئی بات نہیں
مجھ کو ظلمت کی گپھاؤں میں اُتر جانے دے

تو نہ گھبرا کہ ترے حُسن کی مشعل لے کر
تیرے ہمراہ کبھی تیرے بچھونے کے قریب
رات بھر دھوم مچائے گا مرے جسم کا بھوت
آج پھر گھات میں بیٹھا ہے سمندر کا سکوت

ظرف باقی نہ کوئی عزمِ نہاں باقی ہے
صرف احساس کے چہرے پہ دھواں باقی ہے

کوئی سایہ ہے، نہ ساتھی ہے، نہ محفل کوئی
دلکشی ختم ہے، پھر کیوں یہ جہاں باقی ہے

یہ جہاں جس میں سب اطراف تباہی کے نشاں
صورت و شکل پہ زخموں کی طرح پھیلے ہیں
اور ہر زخم ہے انسان کی وحشت کا ثبوت
آج پھر گھات میں بیٹھا ہے سمندر کا سکوت

تلخ تنہائی کا اک درد لیے چہرے پر
لے کے پھرتا ہوں میں، زخموں کے دیے چہرے پر
رُوح مجروح، جبیں زخم زدہ، دل گھائل
پھر بھی ہنستا ہوں نئی آس لیے چہرے پر

زندگی ہے کہ کسی شاہ کی بیگم جس کو
وقت بازار میں لایا ہے برہنہ کر کے
اور خاموش ہیں تہذیب و تمدن کے سپوت
آج پھر گھات میں بیٹھا ہے سمندر کا سکوت

وقت کہتا ہے ہمیں دُور ہی رہنا ہوگا
ہم کو ہر حال میں مجبور ہی رہنا ہوگا

راج نرائن راز

سبز آنکھوں سے

ہوائیں سمندر کو لوٹیں
تو بولیں :
سڑک پر وہاں کوئی ایسا شجر ہی نہیں ہے
کہ ہو جس کی شاخوں میں نرمی صبا کی
کہ ہوں جس کے پتّے
ابھرتے نئے دن کی زرکار کرنوں سے روشن
پرندوں نے جس پر نہ ڈالا ہو ڈیرا
نہ لپٹی ہوں بیلیں ہی شاخوں سے جس کی
تنا بھی ہو سیدھا ـــــ
ہوائیں سمندر کو لوٹیں
تو بولیں ـــــ
وہاں ایک آنگن میں
اک پیڑ ہے
جس کی شاخیں سیاہ
جس کے پتّوں کے ریشے ـــــ !
بڑھاپے کی روشن لکیریں ہوئے ہیں

بسیرا ہے جس پر کئی طائروں کا
کئی گھر کیے ہیں
کئی اُڑ گئے ہیں
کئی ایک بیلیں بھی لپٹی ہوئی ہیں
تنا ہے غمیدہ !
وہ ایسا شجر ہے
کہ تم جس کی شاخوں سے لپٹی ہوئی
سبز آنکھوں سے پل پل
خلا کی طرف دیکھتی ہو

maablib.org

کنول کی موت

جمناتٹ پر
شام! سلونا راہ تکے تھا
——— دیر ہوئی تھی
گاگر بھر کر نرمل جل کی
میں جلدی سے گھر کو لوٹی
دیر ہوئی تھی

میں نے دیکھا
——— ایک انوکھا
اُجلا — پھول کنول کا
——— اُجلا
تیر رہا تھا گاگر کے اس نرمل جل میں
میں نے ہاتھ بڑھا کر
اس کو ———
ٹانک لیا اپنے جوڑے میں

درپن بولا
آنکھیں روشن
ماتھا چندن
جسم ہے کندن
چال نرالی
بات نئی ہے
دروازے نے آہٹ پائی
اماں مجھ کو گھور رہی تھی
بولی: پھول کہاں سے پایا تو نے
زیب نہیں دیتا یہ تجھ کو
تو تو لڑکا ہے
نوچ لیا!
اماں نے اُجلا پھول کنول کا
پھینک دیا کھڑکی سے باہر
من درپن تاریک ہوا تھا
میں نے کھڑکی کھول کے دیکھا
پھول کنول
کھڑکی کے نیچے!
خون ہوا تھا
اک دھبّہ تھا
گہرے خون کا اک دھبّہ تھا

خود کلامی

نارسی سس نہ بنو
جھیل کی تہہ میں کبھی جھانک کے دیکھا نہ کرو
اس کا شفاف
حسیں
اور بلوریں سینہ
چہرہ بربادی ہے
ایسے غافل نہ بنو

اورفی یس نہ بنو
اپنے ماضی کی حسیں یاد کو دھیرے دھیرے
اپنے پیچھے
صفتِ سایہ چلی آنے دو
اتنے بے تاب ہو کیوں
آنکھ افق پر رکھو
کام لو ہوش سے یوں لوٹ کے دیکھا نہ کرو
یوری ڈس عالمِ اسرار میں کھو جائے گی
اس کے قاتل نہ بنو!

ایک نظم

نہیں !
ہرگز نہیں
میں کوئی بحرِ بیکراں ___ کب ہوں !
میں ! اک قطرہ فقط اک بوند ہوں
آغوشِ گل میں
صبح دم جو مسکراتی ہے
نئے خورشید کی پہلی کرن سے جگمگاتی ہے
ہوا کے تیز جھونکوں سے لرزتی ہے ___ جو رہ رہ کر
کرن کا لمس پاکر کپکپاتی !
ٹوٹ جاتی ہے
گلوں کا منہ دُھلاتی ہے
فضا کی
نکہتوں، رنگینیوں کی جزوِ جاں ہوکر
وجود اپنا گنواتی ہے
.... لامحدود ہوتی ہے

عذاب

مجھے شک کی نظروں سے کیوں دیکھتے ہو!
مری بات سچ ہے!
مری بات سچ ہے: میں کل رات ناگوں سے لڑتا رہا ہوں

کنہیّا نہیں میں جو ناگوں کو نتھ لوں
میں ایسا بڑا کوئی انسان کب ہوں
جو حرفِ شکایت بھی لب پر نہ لائے
نہ جو یہ کہے ——
میں تو بس —— باز آیا
وہ گوریلا فوجیں ہیں یا ناگ کالے
نکلتے ہی دن کے وہ جاتے کہاں ہیں
یہ کس کو خبر! دن میں رہتے کہاں ہیں
پلٹتے ہیں راتوں کو اس طرح مجھ سے
امربیل پیڑوں کی شاخوں سے جیسے
وہ رہ رہ کے پھنکارنا ان کا! توبہ
کہ خودکار بندوق کی گولیاں ہوں

میں ان سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں
مرا جسم زنداں ہے! بے بس ہوں اس میں
کوئی دیو قد بیڑیوں میں ہو جیسے
مری بات سچ ہے
مری بات سچ ہے: نہیں ہے کسی جنگ کا یہ فسانہ
حقیقت ہے یہ، اس کو دھوکا نہ سمجھو
ہوا پچھلی راتوں میں کیا کچھ نہ پوچھو

نگلتا ہے جب بھی اندھیرے کا اجگر
مکینوں، مکانوں کو، دیوار و در کو
نگلتا ہے عفریت جب خامشی کا
صداؤں کا جنگل، نواؤں کی نگری
—— وہ ایسے میں آتے ہیں جانے کہاں
مرے جسم میں سرسراہٹ بڑی ہے
اچانک میں گھبرا کے اُٹھ بیٹھتا ہوں
کساں خواب میں دیکھ کر آگ جیسے
سرکشت گھبرا کے اُٹھ بیٹھتا ہے

جو ہیں سلوٹیں میرے بستر میں صدہا
وہ سانپوں کے انداز میں رینگتی ہیں
مری سیج سانپوں کا مسکن بنی ہے

رفعت سروش

سیاہ رات

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
سیاہیاں رقص کر رہی ہیں
سیہ فلک پر سیہ ستاروں کی کہکشاں ہے
سیہ زمینوں کی کوکھ میں ہیں سیاہ گلشن
سیاہ پھولوں کی ناگنوں کی
سیہ زبانیں لپک رہی ہیں
سیاہ خنجر، سیاہ سینے
سیاہ دل ہیں، سیاہ خوں ہے
سیاہ پتھر پہ کالے حرفوں سے لکھ رہا ہے سیہ زمانہ
سیاہ شب کا سیہ فسانہ

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ رات صدیوں سے ہے مسلط
سنا ہے سورج سیاہیوں کے مہیب نرغے میں آگیا ہے

تنہائی میں

گھنگرو سے بجاتی ہیں تنہائیاں کمرے میں
کمرے کی ہر اک شے پر،
سو نقش ہیں یادوں کے
بیوی کے تکلم کی سرگوشیاں رقصاں ہیں
احباب کی باتوں کے انداز غزل خواں ہیں

بچوں کی ہنسی، جیسے نغمہ ہو ستاروں کا
احساس کی وادی میں عالم ہے بہاروں کا
گھنگرو سے بجاتی ہیں تنہائیاں کمرے میں

ایسا نہ ہو، آئینہ احساس کا چھٹ جائے
تنہائی کے ہاتھوں سے
کس طرح اٹھاؤں گا میں ٹوٹی ہوئی کرچیں
بھیگی ہوئی پلکوں سے

نوحہ

نوحہ ان کا نہیں:
گزر گئے جو،
زندگی کی اُداس راہوں سے
پھینک کر بوجھ اپنے کاندھوں کا

نوحہ ان کا،
جو اب بھی جیتے ہیں
جبر کو زندگی بنائے ہوئے
مرنے والوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے

maablib.org

بے صدا الفاظ

تمہاری یاد میں کل شب
عجب اک واقعہ گزرا
لغت کے برف خانے سے نکل کر!
'بے صدا الفاظ'
مرے روبرو آئے
تلاشِ صوت و معنی میں

میری خلاق فطرت نے
تمہارے رنگ و نکہت کو،
تمہارے روپ کی انگڑائیوں کو،
بے صدا الفاظ کے اجسام میں ڈالا
ہوا محسوس،
تم ہو روبرو
لفظوں کے پیکر میں

لڑکپن

دیکھ یہ صبحِ زمستاں اوس میں بھیگی ہوئی
کہر میں لپٹی ہوئی
ٹھنڈ میں ٹھٹھرے کھڑے ہیں اس گلی کے سب مکاں
دھوپ اُگی ہے فقط مسجد کے اس مینار پر

اک شکستہ گھر کا دروازہ کھلا،
ایک لڑکا ننگے سر اور ننگے پاؤں
گھر سے نکلا ہاتھ بغلوں میں دبائے
اور بستہ اپنے سینے سے لگائے
ملگجی سی ہے کرن امید کی !!
اس کے چہرے پر اداسی کی بجائے
جا رہا ہے بارِ مستقبل کا شانوں پر اٹھائے
یہ مرے البم کی اک تصویر ہے
میرے احساسات کی تحریر ہے

زبیر رضوی

علی بن متقّی رویا

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
علی بن متقی مسجد کے منبر پر کھڑا
کچھ آیتوں کا ورد کرتا تھا
جمعہ کا دن تھا
مسجد کا صحن
اللہ کے بندوں سے خالی تھا
یہ پہلا دن تھا مسجد میں کوئی عابد نہیں آیا
علی بن متقی رویا
مقدس آیتوں کو مخملیں جُز دان میں رکھا
امام دِل گرفتہ
نیچے منبر سے اُتر آیا
خلا میں دور تک دیکھا
فضا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی
دُھند کی کائی

ہوا پھر یوں
منڈیروں، گنبدوں پر ان گنت پر پھڑپھڑائے
کاسنی، کالے کبوتر
صحن میں نیچے اُتر آئے
وضو کے واسطے رکھے ہوئے لوٹوں پر
اک اک کر کے آ بیٹھے
امام دل گرفتہ
پھر سے منبر پر چڑھا
جزدان کو کھولا
صفوں پر اک نظر ڈالی
یہ پہلا دن تھا مسجد میں
وضو کا حوض خالی تھا
صفیں معمور تھیں ساری!

mablib.org

کتّوں کا نوحہ

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
بنی قدوس کے بیٹوں کا
یہ دستور تھا
وہ اپنی شمشیریں
نیاموں میں نہ رکھتے تھے
مسلح ہو کے سوتے تھے
اور ان کے خوبرو گبرو
کمانے تیروں کی صورت
رات بھر
مشعل بکف
خیموں کے باہر جاگتے رہتے
بنی قدوس کے بیٹے
بلاؤں اور عذابوں کو
ہمیشہ لغزشِ پا کا صلہ گنتے
گناہوں سے حذر کرتے

مگر اک دن
کہ وہ منحوس ساعت تھی خرابی کی
زنانِ نیم عریاں دیکھ کر خانہ بدوشوں کی
کچھ ایسے مرمٹے
جب رات آئی تو
بنی قدوس کے بیٹوں کی شمشیریں
نیاموں میں پڑی تھیں
اور دیواروں پہ لٹکی تھیں
وہ پہلی رات تھی
خیموں کے باہر گھپ اندھیرا تھا
فضا میں دور تک
کتوں کی آوازوں کا نوحہ تھا

maablib.org

بشارت پانی کی

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
وہ سب پیاسے تھے
میلوں کی مسافت سے بدن بے حال تھا ان کا
جہاں بھی جاتے وہ دریاؤں کو سوکھا ہوا پاتے
عجب بنجر زمینوں کا سفر درپیش تھا ان کو
کہیں پانی نہ ملتا تھا
کھجوروں کے درختوں سے انھوں نے اونٹ باندھے
اور تھک کر سو گئے سارے
انھوں نے خواب میں دیکھا
کھجوروں کے درختوں کی قطاریں ختم ہوتی ہیں جہاں
پانی چمکتا ہے
وہ سب جاگے
ہر اک جانب تحیّر سے نظر ڈالی
وہ سب اُٹھے
مہاریں تھام کر ہاتھوں میں اونٹوں کی

کھجوروں کے درختوں کی قطاریں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں
زبانیں سوکھ کر کانٹا ہوئی تھیں
اور اونٹوں کے قدم آگے نہ اٹھتے تھے

وہ سب چیخے
بشارت دینے والے کو صدا دی
اور زمیں کو پیر سے رگڑا
ہر اک جانب تحیّر سے نظر ڈالی
کھجوروں کے درختوں کی قطاریں ختم تھیں
پانی چمکتا تھا!!

maablib.org

سیاہ پٹی

ہم ابھی کچھ دیر پہلے ساتھ تھے
شہر سارا یوں لگا تھا
جیسے اپنے ہی تعاقب میں
کرن سورج کی تھامے چل رہا ہے
اس کی آنکھیں بن کے پتھر اُٹھ رہی تھیں
قرب کے آئینے چھن سے ٹوٹ کر ریزہ ہوئے تھے
ہونٹ اپنے سل گئے تھے
جسم اپنے جل گئے تھے
ہم بچھڑ کے نامرادوں کی طرح
واپس ہوئے تو
شہر سارا اجنبی سا ہو گیا ہے
اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہے

maablib.org

اکیلے ہونے کا خوف

ہمیں یہ رنج تھا
جب بھی ملے
چاروں طرف چہرے شناسا تھے
ہجوم رہگزر بانہوں میں باہیں ڈال کر چلنے نہیں دیتا
کہیں جائیں
تعاقب کرتے سائے گھیر لیتے ہیں
ہمیں یہ رنج تھا
چاروں طرف کی روشنی بجھ کیوں نہیں جاتی
اندھیرا کیوں نہیں ہوتا
اکیلے کیوں نہیں ہوتے
ہمیں یہ رنج تھا
لیکن یہ کیسی دوریاں
تاریک سناٹے کی اس ساعت میں
اپنے درمیاں پھر سے چلی آئیں

ساغر نظامی

ضمیر

چلتے چلتے یہ ابھی کس نے پکارا مجھ کو!؟

روح کیوں شدتِ احساس سے تھراتی ہے — کپکپاتی ہوئی یہ کس کی صدا آتی ہے
پیچ در پیچ یہ سنسان یہ مُردہ رستے — سرد و بے نور درختوں کے مجھک سرسائے
کوئی بھٹکا ہوا راہی تو نہیں محوِ فغاں — مل گیا کیا مری گمراہیوں کو ذوقِ بیاں
دُور یہ اُڑتے ہوئے بال یہ پھیلے ہوئے ہات — جیسے آتی ہو اندھیرے کی ستائی ہوئی رات
ہر نفس گونجتی ہے کس کی صدائے ماتم — کس کے نالوں سے گرجتا ہے یہ زندانِ الم؟
سازِ خاموشِ فضا چھیڑ دیا ہے کس نے — چلتے چلتے یہ مرا نام لیا ہے کس نے؟

چلتے چلتے یہ ابھی کس نے پکارا مجھ کو؟

یاد کیوں ہوگا وہ آغازِ فسانہ تم کو؟

تشنہ و گرسنہ جذبوں میں وہ ڈوبی ہوئی شام — نہ کوئی فرقِ مراتب نہ کوئی قیدِ نظام
وہ شبِ تار کا جادو، وہ ستاروں کا طلسم — ہوش کے ساتھ اڑے جاتے تھے افلاک پہ جسم
ایک آغاز نہ تھا جس کو شعورِ انجام — ایک انجام جسے راس نہ تھی قیدِ دوام
تھی تو سرشارِ محبت کے اُجالوں کی امیں — کیا تمہیں آج وہ تاریکیِ شب یاد نہیں؟
یاد کیوں ہوگا تمہیں اُن مرے اشکوں کا سفر — پھوٹ نکلے تھے جو طوفان کے دھارے بن کر
وہ جھجکتی ہوئی خوشیاں، وہ لرزتے آلام — ہچکچاتا ہوا عصیانِ وفا کا اقدام

میری خاکسترِ احساس کو دہکایا تھا　　تم نے اقرارِ وفا سے مجھے بہکایا تھا
کیے رہتے ہیں مرے دل کو جہنم بکنار　　میرے احساس سے لپٹے ہوئے بوسوں کے شرار
ظلم و عدوان کے چہروں پہ ہے زردی تم سے　　روحِ پیمان شکنی کانپ رہی ہے تم سے
یاد کیوں ہوگا وہ آغازِ فسانہ تم کو!؟

چلتے چلتے یہ ابھی کس نے پکارا مجھ کو!؟
روحِ پیمان شکنی کانپ رہی ہے مجھ سے　　کس کا یہ شکوۂ پیمان شکنی ہے مجھ سے!؟
دل کو رہ رہ کے سرِ راہ مسلتا ہے یہ کون؟　　میرے اعصابِ دماغی کو کچلتا ہے یہ کون؟
چلتے چلتے یہ ابھی کس نے پکارا مجھ کو!؟

وہ شبِ ماہ، وہ بپھرے ہوئے دریا کا خروش　　نئے اٹھتے ہوئے طوفان کا سینوں میں وہ جوش
بے نیازِ غمِ گردابِ فنا تھی ہستی　　ایک ہنستا ہوا طوفانِ بلا تھی ہستی
جانے کس سمت رواں تھی مری کشتیِ حیات　　بحرِ ظلمات کو طے ہم نے کیا رات کی رات
"ہم رکابی میں مشیت تھی، جلو میں تقدیر　　کفِ موسیٰ تھی محبت، یدِ بیضا تھا ضمیر
رَو میں چلتے ہی گئے سامنے بڑھتے ہی گئے　　ایک انجان سے آکاش پہ چڑھتے ہی گئے
اور صدیوں کا پرانا وہ پُراسرار درخت　　مسندِ عظمتِ تاریخ، مہ و سال کا تخت
جس کے سائے میں لرزتا تھا محبت کا ضمیر　　جس کی آغوش میں ہنستا تھا فریبِ تقدیر
جس کے پتوں میں تھے بھیدوں کے خزانے مدفون　　شمعِ اسرار فضا تھا وہ اندھیرے کا ستون
جس کی شاخوں میں ہوا ساز بجاتی تھی کبھی　　ابدی موت کا اک راگ سا گاتی تھی کبھی"
آہ! صدیوں کا پرانا وہ پُراسرار درخت

چلتے چلتے یہ ابھی کس نے پکارا مجھ کو!؟
میرے سینے پہ جھکے پڑتے ہیں با جذب تمام　　طنز کرتے ہوئے ماضی کے وہ صحن و در و بام

جن کی آغوش میں خوابوں کا جہاں بستا تھا
یہ جہانِ گزران رقصِ گناں بستا تھا
چٹکیاں لیتے ہیں سینے میں مرے سینکڑوں ہات
نوچ ڈالے گی مری روح کو کیا میری حیات
میرے حلقوم پہ ہے پنجۂ سنگین کس کا؟
ہیبتیں گھونٹ نہ دیں میرے تنفس کا گلا
کس کے ناخن ہیں کہ پیوست ہوئے جاتے ہیں
میرے احساس و تخیل میں گڑے جاتے ہیں
چلتے چلتے یہ ابھی کس نے پکارا مجھ کو؟!

دل سے اک اٹھی صدا آئی ہے وہ بھی تو سُنوں
"خود تری ذات ہے سرچشمۂ اسرار و فسُوں"
تیرے ساغر ہی کا فیضان ہے یہ موجِ سرور
خود تری شمع کا پرتو ہے یہ روتا ہوا نُور
روح ہے آج بھی ماحول و وراثت کی اسیر
آج بھی خوف کی مخلوق ہے آوازِ ضمیر
یہ وراثت کا کرشمہ یہ روایت کا فسوں
بار ہے ذہن پہ یہ مُردہ حکایت کا جنوں"
اور صدیوں کا پُرانا وہ پُراسرار درخت

"تیری مجبوریِ افلاس کا بھی شاہد ہے
تیرے تپتے ہوئے احساس کا بھی شاہد ہے
فکرِ انجام نے طوفان اُٹھائے ہیں بہت
قہقہے اس کی خموشی نے لگائے ہیں بہت
اس نے دیکھا نہ کبھی تیری نظر اس پہ گئی
عشق کے بیچ میں ایک آہنی دیوار بھی تھی
سر کو ٹکراتے تھے دیوار سے ہو کر مجبور
تیرا پندار کبھی اس کی امارت کا غرور
تیرے ہی ہونٹ ہیں تیری ہی صدا کچھ بھی نہیں
تیرے ہی ہات ہیں تیرا ہی گلا کچھ بھی نہیں"
اور صدیوں کا پُرانا وہ پُراسرار درخت
عشق کے جذبۂ ناپختہ و رنگیں کی قسم
سنتری آج بھی ہے نفرتِ بے پایاں کا

اتنی فرصت کہاں ؟

یہ ہنستی ہوئی رات یہ مست دریا — یہ دریا، یہ انجم، یہ ساغر، یہ مینا
سنو تو مگر اے مرے دل کی ملکہ — نہیں جاوداں یہ سنہری تماشا
روا بھی ہیں مدہوشیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
گلوں سے مہکتا سفینا بھی برحق — مے و ساغر و جام و مینا بھی برحق
پلانا بھی برحق ہے پینا بھی برحق — محبت کی اک رات جینا بھی برحق
مگر میں نہیں شادماں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
یہ منظر سلگتے ہوئے بام و در کا — کلیجہ دہلتا ہے برق و شرر کا
دھڑکتا ہے دل وسعت بحر و بر کا — مجھے ہو تصور نسیم سحر کا
جوانی ہو جنت نشاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
وہ امڈے شراروں کے طوفان دیکھو — وہ برسے جہنم کے سامان دیکھو
سلگتی ہوئی نسل انسان دیکھو — نہ روکو، نہ روکو، مری جان دیکھو
قیام اب ہے یکسر زیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

رہِ زندگی پُر خطر ہے مسلسل کہ یہ عالمِ خیر و شر ہے مسلسل
بظاہر حدوں میں مگر ہے مسلسل مسافر مسلسل، سفر ہے مسلسل
نہ منزل نہ کوئی نشاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

تخیّل میں ہیں لاکھ مبہم ارادے مچلتے ہیں دل میں یہ تخئیل زادے
ہے اک جسمِ کمزور لاکھوں لبادے مسافر ہوں تنہا ہزاروں میں جادے
سجاؤں نیا کارواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

اٹھائے نقاب اپنے رُخ سے جوانی نمایاں ہوں خال و خطِ زندگانی
فسانہ محبت کا دل کی کہانی ادا ہوں یہ قصے جنوں کی زبانی
یہ ٹکڑے ہوں کھل کر بیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

مبصر ہوں میں فطرتِ زندگی کا میں نباض ہوں حکمتِ زندگی کا
مغنّی ہوں میں عشرتِ زندگی کا حُدی خواں ہوں میں عظمتِ زندگی کا
خود اپنا بنوں نوحہ خواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

ہنسے میری بے رنگیوں پر زمانہ مجھے ناگوارا ہوا اپنا ترانہ
مری مستیاں ہوں بہ شکلِ فسانہ بہلا کر مجھے وقت خود ہو روانہ
ابد تک رہوں سرگراں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

عہد

جب طلائی رنگ سِکّوں کو نچایا جائے گا
جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائے گا
جب رگِ افلاس کو میری دبایا جائے گا
اے وطن اُس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور اپنے پاؤں سے انبارِ زر ٹھکراؤں گا

جب مجھے بیڑوں سے عُریاں کر کے باندھا جائے گا
گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا

اے وطن جب تجھ پہ دشمن گولیاں برسائیں گے
سُرخ بادل جب فصیلوں پر تری چھا جائیں گے
جب سمندر آگ کے بُرجوں سے ٹکر کھائیں گے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیغ کی جھنکار بن کر مثلِ طوفاں آؤں گا

گولیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی جب مجھے
اور تنہا چھوڑ جائے گا ہر اک جب مجھے
اور سنگینوں پہ چاہیں گے اٹھانا سب مجھے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
مرتے مرتے اک تماشائے وفا بن جاؤں گا

خون سے رنگین ہو جائے گی جب تیری بہار
سامنے ہوں گی مرے جب سرد نعشیں بے شمار
جب مرے بازو پہ سر آ کر گریں گے بار بار
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور دشمن کی صفوں پر بجلیاں برساؤں گا

جب درِ زنداں کھلے گا برملا میرے لیے
انتہائی جب سزا ہو گی روا میرے لیے
ہر نفس جب ہو گا پیغام قضا میرے لیے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
بادہ کش ہوں زہر کی تلخی سے کیوں گھبراؤں گا

حکم آخر قتل گہ میں جب سنایا جائے گا
جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا
جب یکایک تختۂ خونی ہٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

ناگ

آؤ میں تن من میں بسالوں' اے بانبی کے باسی
تن ہے خالی' من ہے سُونا' روح سکوں کی پیاسی
آؤ میں تن من میں بسالوں' اے بانبی کے باسی

نازک نازک سے یہ پودے' ہری ہری یہ گھاس
ننھے ننھے یہ گل بوٹے ' بھینی بھینی باس
صبح کی گودی میں جاگے ہو' اے نیندوں کے ماتے
سینہ تانے پھن پھیلائے' کچھ کچھ کنڈلی مارے
اور جو یونہی ہاتھوں پہ اٹھالوں
آؤ میں تن من میں بسالوں' اے بانبی کے باسی

سبزے کے دامن پہ ہو یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہہ کر رُخساروں کو گھیرے
سورج کی کرنوں میں ایسے چمک رہا ہے مکھڑا
جھل مل جھل مل جیسے جھومر کرے کسی دلہن کا
اس جھومر کو کیوں نہ چرالوں
اس جھومر کو کیوں نہ چرالوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

مستی کا لہراتا پیکر' سر سے پا تک کالے
موت کی وادی کے رکھوالے' اے قہروں کے پالے
ابرِ سیہ اُترا ہے زمیں پر تازہ شبنم پینے

جیسے کوئی لوٹ رہا ہے یا موتی کے خزینے
میں بھی اک موتی کو اٹھالوں
میں بھی اک موتی کو اٹھالوں' اے بانی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں' اے بانی کے باسی

اپنی ہی مستی کی دُھن میں جھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکھنی کنواری مدرا پی کر جھومے

اندھیاری درپن ہے تمہارا' نور تمہارا ہالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے مالا
اپنے گلے میں تم کو ڈالوں!؟
اپنے گلے میں تم کو ڈالوں' اے بانی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں' اے بانی کے باسی

یا کوئی مغرور جوانی جھوم رہی ہو پی کر
یا طوفانوں میں لہرائے جیسے کالا ساگر

پاپ کی میٹھی اندھیاری ہو یا مستی کا سویرا
موت کی روشن تاریکی ہو یا جیون کا اندھیرا
اُمیدوں کا دیپ جلالوں!؟
امیدوں کا دیپ جلالوں' اے بانی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں' اے بانی کے باسی

موت کی گردن کے اے ہیکل' اے شنکر کے جوشن
بربادی کے زہری کنگن اے کالی کے جھانجھن

میں نے مانا زہر ہے تم میں' وِس کی تم ہو مینا
لیکن میں نے سیکھا ہے' "زہر آب مقدر" پینا
ساقی کیا تم کو بھی بنالوں!؟

ساتھی کیا تم کو بھی بنا لوں' اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں' اے بانبی کے باسی

اے بانبی کے بسنے والے تم کیا ہو زہریلے
لاکھوں ناگ ہیں انسانوں میں گورے کالے پیلے
مُلّا' نیتا' پیر اور پنڈت' راجے' پانڈے' لالے
بستے ہیں دنیا میں تم سے بڑھ کر ڈسنے والے
تم سے میں کیا من کو ڈسا لوں !؟
تم سے میں کیا من کو ڈسا لوں' اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں' اے بانبی کے باسی

بس ہے تمہارا بوند برابر' ان کا زہر سمندر
ڈنک تمہارا دیرانوں تک' ان کا ڈسنا گھر گھر
تیرا کاٹا اِک دن جیوے' ان کا کاٹا پل بھر
سحر تمہارا تن پر بولے' ان کا جادو من پر
مَن سے ان کا زہر ہٹا لوں
من سے ان کا زہر ہٹا لوں' اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں' اے بانبی کے باسی

انسانی ناگوں کے بیاں ہوں کیا زہری افسانے
تیرا ڈسنا چھُپ چھپ کر ہے' ان کا کھُلے خزانے
ڈستے ہیں اور پھر کہتے ہیں' موت نہ آنے پائے
تیرا بس تو رکھتا ہے ہر زخمی دل پر پھائے
داروئے آلام چرا لوں !!؟
داروئے آلام چرا لوں' اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں' اے بانبی کے باسی

بھکاری کی صدا

بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز
کیوں بجتا ہے اب بھی پاپی یہ جیون کا ساز

طوفان سر پر، رات اندھیری، ہر دم اک منجدھار
پیالہ میرا ٹوٹا ہے اور قسمت کھیون ہار
بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز

یہ گودھ تاروں کے ہمسائے، یہ اونچے استھان
یاں مانگے پر بھی ملتا ہے کب بھکشو کو دان
جس کو دیکھو داتا ہے اور سب داتا ہیں چور
بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز،

چاند ستارے لعنت بھیجیں، سورج دے دھتکار
بیٹھے بیٹھے دھیان میں مجھ کو دھکے دے سنسار
مایا بن جیون ہے جگ میں جیون کا اپمان
مایا ہی جنجال ہے بابا، مایا ہی نروان
بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز

بھیک، بھکاری، دان اور داتا سب کو پرے جان
پریم بھکاری کب رکھتے ہیں بھکشا پر ایمان
آس یہ ہے وہ چھم چھم کرتی کوٹھوں دوڑی آئے
اُور سے اک آنسو ٹپکے اور پیالہ بھر جائے

سجّاد ظہیر

باڑھ

ندی کی لہریں،
سوتے سوتے،
جیسے ایکدم جاگ پڑیں،
اور جھپٹ پڑیں،
ان گیلے گیلے
مٹی بالو کنکر
پتھر اور سیمنٹ کے
پُشتوں پر
جن سے اُن کو باندھ کے
سب نے رکھ چھوڑا تھا،
لہک لہک کر،
ناچ ناچ کر
شور مچاتی،
چاروں اُور،
گلی گلی کوچے کوچے میں،
گھروں میں، صحنوں میں، کمروں باغوں میں،

کونے کونے میں وہ،
جھٹ پٹ
گھس آئیں
چڑھ دوڑیں!
کوئی چیز نہ چھوٹی اُن سے،
برتن، باسن،
زیور، کپڑے،
کرسی، میز،
کتابیں
بھولے بسرے
خط پتر،
تصویریں،
دستاویزیں،
تحریریں،
بیکار پڑی چیزیں،
وہ جن کے ہونے کا بھی پتہ نہ تھا،
لہروں نے اُن کو گھیر لیا،
دامن میں اپنے
بھینچ لیا
کیچڑ، مٹی میں لت پت کر ڈالا
اور سب کچھ لے کر ڈوب گئیں!
پھر جیسے ایکدم آئی تھیں،
ویسے ہی ہر ہر کرتی،

بل کھاتی، اٹھلاتی،
نکل گئیں!

(۲)

اے کاش، دلوں میں، روحوں میں،
ایسی اک چنچل باڑھ آئے،
بیکار ڈروں کے ڈھیروں پر،
ہمت کی لہریں بکھرا دے،
خود غرضی کے صندوقوں کو،
اک جھٹکا دے کر الٹا دے،
پھاڑے لالچ کی پوٹوں کو،
جالوں کو، جہل و شقاوت کے،
اور ظلم کی گندی مکڑی کو
چکنی کالکھ کو تعصب کی،
نابود کرے، ناپید کرے،
یوں نم کر دے دل کی کھیتی،
امیدیں سب لہرا اٹھیں،
گلنار شگوفے اُلفت کے
سوکھی جانوں سے پھوٹ پڑیں!

اے کاش دلوں میں روحوں میں
ایسی اک چنچل باڑھ آئے

نرالی راتیں

کالی، جگمگاتی، نرالی راتیں،
رس بھری، مدماتی راتیں
رات کی رانی خوشبو سے بھری،
تاروں کی مدھم نورانی چھاؤں میں
ہلکی ٹھنڈی راتیں

بیساکھی ہواؤں
"سارنگی کی لمبی الکسی سسکیوں"
پیار کے رازوں سے بوجھل،
کہانی راتیں،
کہاں کھوگئیں ہیں یارب؟
کھو جائیں
تو پھر کھو جائیں
لیکن وہ من موہک گھڑیاں
خون میں جیسے گھل سی گئی ہیں
وہ لڑکھڑاتے، ادھورے، نامکمل جملے
اب بھی صاف سنائی دیتے ہیں

ابرودَں، پلکوں، ماتھے کی شکنوں کے
بانکے ترچھے پل پل بدلتے زاویئے
جو کیا کیا کچھ کہتے تھے
دکھائی دیتے ہیں،
وہ زینت نئی، انوکھی، بے انتہا خوشیاں
موجود بھی ہیں، زندہ بھی
لیکن درد و الم کی موجیں بن کر
دل کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہیں
یہ تو سنا ہے زہر کبھی امرت بن جاتا ہے۔
لیکن جب امرت خود زہریلا ہو جائے،
پھر آخر کوئی کیسے جیئے؟

maablib.org

کبھی کبھی

کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے
کہ دوستی کے سب روپہلے رشتے،
پیار کے سارے سنہرے بندھن،
سوکھی ٹہنیوں کی طرح،
چٹخ کر ٹوٹ نہ جائیں،
آنکھیں کھلیں، بند ہوں، دیکھیں،
لیکن باتیں کرنا چھوڑ دیں
ہاتھ کام کریں،
انگلیاں دنیا بھر کے قصے لکھیں،
مگر پھول جیسے بچّوں کے،
ڈگمگاتے چھوٹے چھوٹے پیروں کو
سہارا دینا بھول جائیں،
اور سُہانی، شبنمی راتوں میں
جب روشنیاں گُل ہو جائیں،
تارے موتیا چمبیلی کی طرح مہکیں،
پریت کی ریت

نبھائی نہ جائے،
دلوں میں کٹھور تا گھر کرلے،
من کے چنچل سوتے سوکھ جائیں،
یہی موت ہے!
اُس دوسری سے
بہت زیادہ بُری
جس پر سب آنسو بہاتے ہیں،
ارتھی اُٹھتی ہے،
چتا سُلگتی ہے
قبروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں،
چراغ جلتے ہیں،
لیکن یہ، یہ تو
تنہائی کے بھیانک مقبرے ہیں،
دائمی قید ہے،
جس کے گول گنبد سے
اپنی چیخوں کی بھی،
بازگشت نہیں آتی
کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے

maablib.org

محبّت کی موت

تم نے محبت کو مرتے دیکھا ہے؟
چمکتی ہنستی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں
دل کے دالانوں میں پریشان گرم لو کے جھکڑ چلتے ہیں

گلابی احساس کے بہتے ہوئے خشک
اور لگتا ہے جیسے
کسی ہری بھری کھیتی پر پالا پڑ جائے!

لیکن یارب!
آرزو کے اِن مرجھائے سوکھے پھولوں
اِن گم شدہ جنّتوں سے،
کیسی صندلی
دل آویز
خوشبوئیں آتی ہیں!

تصویریں

یک رنگ میں سینکڑوں رنگ ہوتے ہیں
ہلکے، گہرے، مدھم، شفّاف
روشنیوں سے بھرے، چمکتے، جگمگاتے
سرمئی، ابریشمی نقابیں ڈالے
گھلے ملے،
دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی کھیلتے۔
انوکھے نقوش میں ابھرے اترتے ہوئے
یا پھر اتنے گمبھیر
جیسے جہازوں کے لنگر!
ان میں لہریں ہوتی ہیں،
تڑپتی، بے چین، طوفانی
اور ایسی بھی
جن پر سکون کے سائے
چھائے ہوئے ہوتے ہیں
لیکن ان کے نیچے
پہاڑی جھرنوں کی تیزی، تلملاہٹ
جستجو کی لہک
آرزو کی پاگل مہک

چھپی ہوتی ہے
اور جب کئی رنگ
اُن کی بے شمار ترنگیں
طرح طرح کی چھوٹی بڑی
چھپی اور ظاہر لہریں
ملتی ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں
تب نئے حیرت ناک ہیولے
آدھے پورے بل کھاتے دائرے
موہوم نقطے
تھرتھراتی لکیریں
لاجواب شکلیں
اور ایسے پیکر جو کسی دوسری چیز کی طرح نہیں ہوتے
لیکن جو خود اپنی الگ انوپ ہستی میں
نئی نویلی دلہن
نوزائیدہ بچے کی طرح
اچھے لگتے ہیں
وجود میں آجاتے ہیں
جھلملاتے دھبّوں کا یہ شعلہ
انسانی انگلیوں، ذہن اور روح کا یہ کرشمہ
زبان کا یہ جوہری دھاکہ
زندگی کو پر لگا دیتا ہے
اسے اتنا اونچا اُڑا لے جاتا ہے
جہاں سے اس دھرتی

اور اس پر بسنے والوں کو
ہم یوں دیکھتے ہیں
جیسے تیتوق نے اُسے دیکھا تھا
اور اس کی سب اچھائیوں،
خوبصورتیوں
اس کی خوشبوؤں
لطافتوں، رنگینیوں کا پرتو
ہماری روحوں پر بھی پڑتا ہے
ہم بدل جاتے ہیں!
ایسا ہی ایک چتر
تم نے معلوم نہیں،
کن آسمانی رنگوں سے کھینچا
اپسراؤں کی نہ جانے کیسی جادو مدراؤں سے بھرا
سورگ کے کون سے مدھر راگوں میں ڈھالا
اور چپکے سے
من کے گرم، تپتے آنگن میں رکھ دیا
دفعتاً ہزاروں بہاریں جاگ پڑیں
گلابی پنکھڑیاں برسنے لگیں
مہکتی ہواؤں سے
ہلکی ہلکی ٹھنڈی، نرمیاں ٹپک پڑیں
اور زندگی کی خالی مانگ
سیندور سے بھر گئی!

آج پھر یہ کہہ رہا ہوں

آج پھر یہ کہہ رہا ہوں
یا مجھے اپناؤ یا میری کلا میں ڈوب جاؤ
یا تو اک پتھر بنو یا پھول بن کر مسکراؤ
میں تمہاری خواہشوں کے ساتھ سب کچھ سہہ رہا ہوں
آج پھر یہ کہہ رہا ہوں

زندگی اک فن ہے، فن میلا ہے، میلا ایک جہاں،
میرا فن بخشے گا تم کو ظاہری حسن و جماں،
جو بھی چاہو گی، ملے گا،
پھول جیون کا کھلے گا،
تاج چاہو تاج دے دوں، یا ہمیشہ کو [illegible]،
جس طرح بھی دل کہے، میری کلا کا سوز [illegible]،
جو بھی میرے فن [illegible] گی، [illegible]، [illegible]،
رنگ جو بھی دھیان میں لاؤ گی تم، تصویر کا [illegible]،

ہاں، مگر پھر کہہ رہا ہوں
جب یہ سب کچھ پا چکو گی، ایک دولت کھو بھی دو گی،
مجھ سے نفرت ہے مگر یہ حُسنِ نفرت کھو بھی دو گی

سب رہے گا،
میں نہ ہوں گا،
اور تم میری کلا سے مکر سے گھبرا اُٹھو گی،
بیچ ساگر رو پڑو گی، خود بخود چلا اُٹھو گی
ایک ساگر کی طرف اب میں بھی شاید بہہ رہا ہوں،
آج پھر یہ کہہ رہا ہوں . . .

maablib.org

یہ دھرتی خوبصورت ہے

نہیں فاروقی! اس دھرتی کو میں ہرگز نہ چھوڑوں گا
مجھے جس دور نے پالا ہے، وہ بے شک پرانا ہے
مجھے محبوب اب بھی عہد رفتہ کا فسانہ ہے
مگر یہ دورِ نَو
یہ ضو...
شعاعِ آگہی کی رو
میں اتنی خوب صورت زندگی سے منھ نہ موڑوں گا
اجل برحق سہی لیکن
رہے گا جب تلک ممکن
میں چاہوں گا کہ لپٹا ہی رہوں دھرتی کے دامن سے
یہ دھرتی آسمانوں سے زیادہ خوب صورت ہے
یہ محبوبہ ہے
اس میں ماں کی شفقت کی بھی عظمت ہے
زبردستی جو موت آئی
(وہ آتی ہے اور آئے گی)

تو میں کوشش کروں گا شاخ ہائے لالہ و گل کو
جکڑ لوں اپنے ہاتھوں سے
گلابوں سے کہوں گا تم ابھی مجھ کو نہ جانے دو
اگر ہارا تو اس دنیا کی ساری دل کشی لے کر
زمیں کی گود ہی میں ایک گہری نیند سو لوں گا
میں محجوبہ نہیں ماں سے کہوں گا پھر جگا دینا
بڑا ضدی سا بالک ہوں
میں تیری گود سے خود شعلۂ گل بن کے ابھروں گا ــــ!!

ــــ عجب عالم تھا
اور میں آسماں سے سخت برہم تھا
خدا کو گالیوں پر گالیاں دینے میں کھویا تھا
کہ مٹی نے کہا "دیکھو، خدا نے مجھ کو بھیجا ہے
مگر اس وقت مٹی بھی مجھے منحوس لگتی تھی۔
مہینے گزرے فاروقی!
مگر اب سوچتا ہوں میں
کوئی مانے نہ مانے اک خدا ہے ــــ نام جو بھی ہو!

ــــ نہ عمرِ عشق باقی ہے
نہ مے خانہ، نہ پیمانہ
نہ نظروں میں
کسی شہناز لالہ رخ کا کاشانہ
تو کیا حمد و سلام و نعت لکھوں ــــ یہ نہیں ممکن

تو مسجد ہی کروں آباد ـــــ کچھ کرنا ضروری ہے
خدا بھی مجھ کو کاہل پا کے پھر برہم نہ ہو جائے
مگر فاروقی! دنیا آج بے حد خوبصورت ہے
بہ ایں عمرِ طبیعی، مجھ کو بھی اس کی ضرورت ہے
خدا فن کار ہے، وہ بھی یقیناً چاہتا ہوگا
کہ دیکھے اس کی صنعت سے کسے کتنی محبت ہے
اگر میں اس زمیں اور اس کی رعنائی کو اپنا لوں
تو میرا دل یہ کہتا ہے کہ یہ بھی اک عبادت ہے
ابھی یہ سوچتا ہوں کل خدا ہی جانے کیا سوچوں
مسلسل سوچتے رہنا مری بچپن کی عادت ہے
دوالی اور صبحِ عید فاروقی! مبارک ہو
مجھے چھوڑو، میں جس عالم میں ہوں وہ مری قسمت ہے ـــ!!

وہ زندہ ہے —— !

——"گلابی دور" میں
وہ اپنے فن کا شاہزادہ تھا
فضائے عارض و چشم و لب و گیسو کا شیدائی
وہ عُریاں:
نیم عریاں جسم کی قوسِ قزح
اُن کا تاثر
اُن کی بجلی
اپنی تصویروں میں بھرتا تھا
حسینوں کے دلوں میں وہ تھا
خود بھی اُن پہ مرتا تھا —— !
اُسے اس دور میں
عزت ملی
دولت ملی —— لیکن
دلِ رومان پرور میں
کوئی شعلہ سا بھی محسوس کرتا تھا —— !؟

(۲)

مصوّری کے ناطے
اُس کا "شش پہلو" تصوّر
ایک شعلہ تھا
کہ جس نے فن کا وہ پچھلا تصوّر خاک کر ڈالا
وہ تصویروں میں
"تجریدی تصوّر" زندگانی کا
بڑی خوبی سے بھرتا تھا،
دکھائی دینے والا اک نیا سنگیت دیتا تھا۔!

(۳)

وہ جانب دار تھا
اور صاف کہتا تھا:
"____ کہ جب انسانیت
تہذیب
اور اعلیٰ ترین قدریں
گھری ہوں سخت خطروں میں
تو اک فن کار پر بھی یہ بتانا فرض ہوتا ہے
کہ وہ کس کی طرف ہے
فن کا اُس سے کیا تقاضا ہے۔!"

(۴)

"پکاسو" مرگیا
یہ سوگ ہے ____ لیکن
"پکاسو" اب بھی زندہ ہے

وہ اپنے شاہکاروں میں
اُسی انداز سے کھویا ہوا ہے
اور کہتا ہے:
میں زندہ ہوں
دلوں کے درد کو
بے چینیوں کو،
اضطرابوں
اور آہوں کو
کہیں اک "منزل زندہ" سے پہلے موت آتی ہے۔؟

maablib.org

گیتوں کی کوئلیا بولے ــــ!

ـــــ میرے گیتوں کی من بھاؤنی کوئلو !
جب تلک ہو سکے گنگناتی رہو،
اِن دِنوں نبضِ عالم ذرا تیز ہے !
میری کومیناؤں کے باغ کی تیلیو !
اپنے رنگین آنچل اُڑاتی رہو،
جو بھی ہو، یہ فضا بھی جنوں خیز ہے !
کوئلو، کوئلو ! بولتی ہی رہو،
اس سے پہلے کہ بجلی کوئی گر پڑے،
مجھ کو گلشن میں نغمے ہی درکار ہیں !
اے ہواؤ ! یوں ہی ڈولتی ہی رہو
اس سے پہلے کہ یہ صبح بھی ڈھل چکے
مسکرانے کو کچھ پھول تیار ہیں !
ـــــ میرے افکار کی نوجواں زندگی غیر فانی نہیں یہ سمجھتا ہوں میں
میں تو بس حُسن کی مورتی کے لیے اس کے قدموں پہ تازہ ترین پھول ہوں۔
دو گھڑی کے لیے شاد ہو لینے دو، دھوپ بڑھتے ہی میں ختم ہو جاؤں گا۔

یہ سمجھتے ہوئے اے سہانی ہوا!
اے معطر فضا!
اے حسین تتلیو!
میرے گیتوں کی من بھاؤنی کوئلو!
میں نے اپنا مخاطب تمہیں کو بنایا ہے اس دکھ بھری زندگی کو نہیں
یہ گریز ایک لعنت سہی پھر بھی میں سوچتا ہوں اگر حُسن کے واسطے،
بعض ان دیکھی سچائیوں کے لیے
زندگی ہی کے اُن پہلوؤں کے لیے
جو جیسے تھے، جیسے ہیں، جیسے ہی رہیں گے ——
میں اپنے کو برباد بھی کر سکوں
تو بڑی بات ہے —— !
میرے احباب مجھ پر ترس کھائیں گے اور مری روح تسکین پا جائے گی،
—— شکر ہے، حسن کی مورتی کے لیے اک نیا پھول خود کو فنا کر سکا!"

—— کوئلو! میں نے تم کو بتایا تو ہے،
اِن دنوں نبضِ عالم ذرا تیز ہے،
جب تلک ہو سکے بولتی ہی رہو!
مست، ٹھنڈی ہواؤ! خراماں رہو،
سازِ بن کر لبِ لالۂ گُل پر تم جب تلک ہو سکے ڈولتی ہی رہو!
میری تخئیل کے نقرئی آئینو!
مہر و مہ کو گلے سے لگاتے رہو
کون جانے تمہیں ٹوٹ جانا پڑے!
کون جانے تمہیں ٹوٹ جانا پڑے اے مری شاعری کے سُبک آئینو!

آج روئے زمیں پر چمن ہی نہیں گولیوں اور بموں کے دھماکے بھی ہیں،
تم کہ آویزاں ہو معبدِ فکر کی صندلی رنگ کی ایک دیوار پر
یہ دھماکے تمہیں توڑ ڈالیں تو پھر،
آتشیں گیند تم پر اچھالیں تو پھر ـــــ؟
بزمِ گیتی میں جتنی خوشی مل سکے،
جتنی رعنائیاں پا سکو،
جلدی جلدی اُنہیں جذب کر لو ابھی
ورنہ اے آئینو! تم بہت نرم ہو، بربریت کی یورش نہ سہہ پاؤ گے۔
"ـــــ ڈالروں کے چھنکتے ہوئے پاؤں میں
مضطرب زندگی کچھ سکوں پائے گی!"
"آہنی انقلابات کی چھاؤں میں"
لوگ کہتے ہیں: "دنیا سنور جائے گی ـــــ"
لوگ یہ اونچے نعرے لگاتے ہوئے آج باہم لڑائی پہ آمادہ ہیں
ایسے آدرش لے کر کوئی کیا کرے جبکہ خود ہم درندوں کے ہمسایہ ہیں؟!
ـــــ گاؤ گاؤ مدھر گیت اے کوئلو!
میرے نغمات خود مجھ پہ لعنت سہی،
میں شرربار نعرہ نہیں چاہتا۔
ناچو ناچو دھنک سی حسیں تتلیو!
میری خاطر گریزِ حقیقت سہی،
میں گلستاں سے جانا نہیں چاہتا۔
چمکو چمکو مرے نقرئی آئینو!
عہدِ حاضر سے یہ اک بغاوت سہی،
میں بموں کا دھماکہ نہیں چاہتا۔

میں درندوں کی دنیا نہیں چاہتا،
میں درندوں کی دنیا نہیں چاہتا!!
—— میرے افکار کی نوجواں زندگی غیر فانی نہیں یہ سمجھتا ہوں میں۔
پھر بھی اے کونپلو!
اے حسیں تتلیو!
نقرئی آئینو!
جب تلک زندہ ہوں تم مرا ساتھ دو،
اپنے "فن کار" کے ہاتھ میں ہاتھ دو ——!!

madni lib.org

دھواں

ــــــــ وہ قہوہ خانے میں آیا۔
اور ہماری میز کے کنارے بن پوچھے ہی بیٹھ گیا
ہم باتوں میں کھوئے ہوئے تھے ــــــــ
سوچ رہے تھے دنیا کیا ہے۔
کیا یہ اسٹیج ہے جس پر جیون کا ناٹک ہوتا ہے۔
کیا ہم اس بے نام ڈرامے کے ہیں بس فرضی کردار ــــــــ؟
اُلجھی تھی اپنی گفتار ــــــــ
اور اچانک وہ نو وارد
سگریٹ کا ایک گہرا سا کش لے کر ــــــــ اُٹھا
ہم لوگوں کو غور سے دیکھا
اور یہ کہہ کر جانے لگا ــــــــ
"تم سب اتنا سوچ رہے ہو
مجھ سے پوچھو دنیا کیا ہے ــــــــ!
ہم نے سوچا بات کرے گا
لیکن ایک برقی سُرعت سے وہ نو وارد جا بھی چُکا تھا
(بیرے نے بتلایا صاحب! آنے والا دیوانہ تھا)
ــــــــ اب ہم لوگ یہ سوچ رہے تھے
وہ تو خیر ایک فرزانہ تھا
لیکن ہم اس فکر کے ہاتھوں اک دن پاگل ہو جائیں گے۔
سگریٹ اور کافی کے دھوئیں میں اڑ کر بادل ہو جائیں گے ــــــــ!!

شاہد ماہلی

وقفہ

سرد راتوں کی گرمی
جھلستے دنوں کی ہوا لے گئی
ریگ زاروں پہ
بارود کی بُو سے جھُلسے ہوئے خشک پتے
بکھرنے لگے
چیختے، آگ اُگلتے، گرجتے ہوئے
زہر آلود لہجے
اچانک بدلنے لگے
پیلی آنکھوں سے تاریک چشمے اترنے لگے
سارے اخبار کی سرخیاں گھٹ گئیں
سہمی سہمی زمیں، اپنی آغوش میں
ٹوٹے پھوٹے گھروندے چھپائے ہوئے
ہانپتی کانپتی
کھیل کے اک نئے دور کی منتظر
اپنے بیٹوں کی گنتی میں مصروف ہے۔

کہیں کچھ نہیں ہوتا

کہیں کچھ نہیں ہوتا
نہ آسمان ٹوٹتا ہے
نہ زمیں بکھرتی ہے
ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئی ہے
ماہ و سال
شب و روز
برف کی طرح جم گئے ہیں
اب کہیں اجنبی قدموں کی چاپ سے
کوئی دروازہ نہیں کھلتا
نہ کہیں کسی جادوئی چراغ سے
کوئی پریوں کا محل تعمیر ہوتا ہے
نہ کہیں بارش ہوتی ہے
نہ شہر جلتا ہے
کہیں کچھ نہیں ہوتا
اب ہمیشہ ایک ہی موسم رہتا ہے
نہ نئے پھول کھلتے ہیں

نہ کہیں پت جھڑ ہوتا ہے
کھیتوں اور کھلیانوں سے
سجے ہوئے بازاروں تک
نئے موسم کے انتظار میں
لوگ چپ چاپ کھڑے ہیں
نہ کہیں کوئی کنواری ہنستی ہے
نہ کہیں کوئی بچہ روتا ہے
کہیں کچھ نہیں ہوتا۔
راستوں پر اوراق بکھر گئے ہیں
اور کتابوں پہ دھول
دماغوں میں جالے ہیں
اور دلوں میں خوف
گلیوں میں دھواں ہے
اور گھروں میں بھوک
اب نہ کوئی جنگل جنگل بھٹکتا ہے
نہ کوئی پتھر کاٹ کر نہریں نکالتا ہے
کہیں کچھ نہیں ہوتا۔

ایک لمحہ

لمحہ

دل کے بہت پاس سے
گزرا ہوا صرف ایک لمحہ
بہالے گیا ہے
جانے کتنے خوابوں، خواہشوں اور منصوبوں کو
بچا ہے
ہڈیوں تک دھنسا ہوا سناٹا
رکتی ہوئی سانسیں
ڈوبتی ہوئی نبض
اور سرد ہوا جسم
پھر کوئی تیز ہوا کا جھونکا
ڈھیر ساری گڈمڈ آوازیں
چیخ، ہنسی اور مسکراہٹ
گھر، دفتر، بیوی، بچے

اور آئندہ بیس برسوں کا منصوبہ
بھاگتی ہوئی آڑی ترچھی تصویریں
ایک کے بعد دوسرے بے ربط مناظر
اور پھر
ٹھہر گیا ہے گزرے ہوئے لمحے کا سایہ
ڈرا ڈرا سہما سہما دل
اور تھر تھر کانپتا ہوا جسم

maablib.org

عجیب لوگ

عجیب لوگ ہیں
صحرا میں، شہر میں، گھر میں
سلگتی ریت پہ، ٹھٹھرے ہوئے سمندر میں
خلا میں، چاند کی بنجر زمیں کے سینے پر
جو صبح و شام کی بے ربط راہ میں چپ چاپ
تعلقات کی تعمیر کرتے رہتے ہیں
ہوا کے دوش پہ طوفان، زلزلہ، سیلاب
دیا سلائی کی تیلی پہ ٹینک، ایٹم بم
کوئی جلوس، کوئی پوسٹر، کوئی تقریر
امنڈتی بھیڑ کا ہر ووٹ، کوئی بیلٹ بکس
پھسلتی کرسی کا جادو، بسوں کی لمبی کیو،
کہیں پہ صحن میں گوبر، کہیں پہ گائے کا سر
ہر ایک گوشہ ہے شمشان، قبر ہے بستر
اکیلا پھرتا ہے سنسان شہر میں کرفیو

قریب گھونز پہ چھتڑوں میں جسم کے ٹکڑے
ہمکتی رات سے جنمی ہوئی فسردہ صبح
بگڑتے بنتے ہوئے زاویے، کھسکتی اینٹ
تمام سلسلے بے ربط، منقطع رشتے
مگر وہ دوڑتے پیروں پہ اُٹھتے بڑھتے ہاتھ
ہر ایک جبر سے بے خوف، بے نیازانہ
جو صبح و شام کی بے ربط راہ میں چپ چاپ
تعلقات کی تعمیر کرتے رہتے ہیں
عجیب لوگ ہیں!

maablib.org

شمیم کرہانی

روشنی تیز کرو

روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو
گُم ہے اندیشۂ امروز کی ظلمت میں حیات
زُہرہ و ماہ سے محروم ہے جذبات کی رات
زعفراں زار بہشتوں میں بھی اُڑتا ہے غبار
مُلد بردوش فضائیں ہیں جہنم بکنار
تشنگی صبح کی، معمورۂ ہستی میں ہے عام
رکھ دو ظلمت کی ہتھیلی پہ کوئی نور کا جام
اور اس غم کے اندھیرے کو سنانگیز کرو
روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو

در و دیوار پہ سائے کی مسلسل یلغار
اژدہے لوٹتے ہوئے جیسے میانِ کہسار
اور محرابِ شکستہ میں پُراٹی قندیل
بے پر و بال سی آندھی کی ستائی ہوئی چیل
خاکِ پُرخون میں ڈوبے ہوئے قدموں کے نشاں
صحن میں کشتہ چراغوں کی چتاؤں کا دھواں
ان چتاؤں کو سمن پوش و گلریز کرو
روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو

روشنی راہ میں باقی ہے نہ کاشانوں میں،
قمقمے ٹوٹے ہوئے ڈھیر ہیں ویرانوں میں
رات ہے یا کہ سیاہی کا کوئی کوہِ بلند
کب سحر پھینکے گی اس کوہ پہ کرنوں کی کمند
یاس نے زیست کے احساس کو گھیرا کیوں ہے
گھٹ گیا دم یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا کیوں ہے

ساتھیو! شیشۂ رگ ساز کو کچھ تیز کرو
روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو

جوئے خوں چشمِ تمنا سے رواں ہے یہ کیوں
زندگی سوئے تبسم نگراں ہے یہ کیوں
روحِ انساں کو ملے ظلمتِ دوراں سے نجات
سج دو مغموم فضاؤں میں چراغوں کی برات
سوگوارانہ سہی جشن منانا ہوگا
کانپتے ہاتھوں سے یہ جام اٹھانا ہوگا

تھام کر دل کو، اٹھو، بزمِ طرب خیز کرو
روشنی تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو

کھنڈر

اسی اداس کھنڈر کے اداس ٹیلے پر
جہاں پڑے ہیں نکیلے سے سُرمئی کنکر
جہاں کی خاک پہ شبنم کے ہار بکھرے ہیں
شفق کی نرم کرن جس پہ جھلملاتی ہے
شکستہ اینٹوں پر مکڑی کے جال ہیں جس جا
یہیں پہ دل کو نئے درد سے دوچار کیا
کسی کے پاؤں کی آہٹ کا انتظار کیا
اسی اداس کھنڈر کے اداس ٹیلے پر

یہ نہر جس میں کبھی لہر بھی اٹھی ہوگی
جو آج دیدۂ بے آب و نور ہے گویا
جسے حباب کے رنگین قمقمے نہ ملے
بجائے موج، جہاں سانپ رقص کرتے ہیں
یہیں نگاہ تمنا کو اشک بار کیا
کسی کے پاؤں کی آہٹ کا انتظار کیا
اسی اداس کھنڈر کے اداس ٹیلے پر

مہیب غار کے کونے پہ یہ جھکا سا درخت
فضا میں لٹکی ہوئی کھوکھلی جڑیں جس کی
یہ ٹہنیاں جو ہواؤں میں تھر تھراتی ہیں
بتا رہی ہیں کہ ماضی کی یادگار ہیں ہم
انھیں کی چھاؤں میں شام جنوں سے پیار کیا
کسی کے پاؤں کی آہٹ کا انتظار کیا

اسی اداس کھنڈر کے اداس ٹیلے پر

فریبِ نظر

بھیگی بھیگی سی ہوائیں، مہکا مہکا سا چمن
چاند کی پگھلی ہوئی چاندی سے دھرتی سیم تن
شاخ کے نیچے پری پیکر سا کوئی خندہ زن
چمپئی رخسار، لب رنگیں، گلابی پیرہن
میں نے یہ سمجھا کہ تم ہو، تم نہ تھے، وہ پھول تھا

دھیرے دھیرے چہرۂ سیمیں سے سرکاتا نقاب
رات، میخانے کے اک گوشے سے اُبھرا ماہتاب
پھول بکھراتا تبسم، رنگ برساتا شباب
نیند کی ترسی ہوئی آنکھوں پہ ٹپکاتا شراب
میں نے یہ سمجھا کہ تم ہو، تم نہ تھے، وہ جام تھا

شب کے سینے پر اندھیروں کی چٹانیں تھیں دھری
ناگہاں بادل سے نکلی مسکراتی اک پری
سیم گوں ماتھا، روپہلا جسم، مانگ افشاں بھری
دیکھ کر سینے میں ٹھنڈک آ گئی، آنکھوں میں تری
میں نے یہ سمجھا کہ تم ہو، تم نہ تھے، وہ چاند تھا

دور تاروں سے جہاں ملتی ہے شامِ رہگزر
اب بھی دو پرچھائیاں پڑتی ہیں جس کی خاک پر
جس جگہ مل کر گلے چھوٹے تھے ہم با چشمِ تر
بارہا کوئی مجھے ہنستا ہوا آیا نظر؟
میں نے یہ سمجھا کہ تم ہو، تم کہاں تھے، وہم تھا

حُسنِ سیمیں سے فضاؤں میں اُجالا سا کیے
نشۂ عہدِ جوانی سے پریشاں، بے پیے
سُرخ آنکھوں میں جلائے شامِ مستی کے دیئے
کوئی میرے پاس آیا، ہاتھ میں ساغر لیے
میں نے یہ سمجھا کہ تم ہو، تم کہاں تھے، خواب تھا

انھیں تاروں کے تلے

اسی آکاش کے نیچے، انھیں تاروں کے تلے
ہم نے اک روز محبت کی قسم کھائی تھی
نقرئی رات، حسیں پھول، فروزاں شبنم
دو دھڑکتے ہوئے دل، عہدِ وفا کا آغاز
وقت کی راہ میں بے تاب خوشی کے لمحے
ٹھہری ٹھہری غمِ دوراں کے قدم کی آواز
دیکھ کر تیری نگاہوں میں محبت کی نمی
چاند تاروں کی نظر میں چھلک آئے آنسو
تھا مشیت کا اشارہ کہ ہوا کا جھونکا
چھا گئے عشق کے شانوں پہ بکھر کر گیسو
دل نے پھر دل سے کیے عہدِ وفا مل کے گلے
اسی آکاش کے نیچے انھیں تاروں کے تلے
ہم نے اک روز محبت کی قسم کھائی تھی

آج وہ رات وہی تاروں بھری رات ہمیں
ڈھونڈتی پھرتی ہے وادی کے شبستانوں میں
کنج ہر گل کو گلہ ہے کہ مرے دامن میں
آج اک ساتھ خراماں نہیں دو سائے کیوں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ہر اک راہ گزر
پوچھتی ہے کہ اکیلے ہی چلے آئے کیوں
مسکراتی ہوئی کلیوں میں نہاں ہے کوئی طنز
شکوہ کرتی ہوئی گلشن کی ہوا آتی ہے
یاد کرتے ہیں محبت کی قسم کے آنسو
آنکھ جھپکتی ہے جو شبنم پہ نظر جاتی ہے
کہ اس وادیٔ رنگیں میں، کبھی رات ڈھلے
اسی آکاش کے نیچے، انھیں تاروں کے تلے
ہم نے اک روز محبت کی قسم کھائی تھی

"راہ گزر"

(تھرتھراتا ہوا احساس کے غم خانے میں
نرگسی آنکھوں کا معصوم سا شکوا دن رات
زیست کے ساتھ رہا کرتا ہے سائے کی طرح
چند اُترے ہوئے چہروں کا تقاضا دن رات)
(شام ہوتی ہے تو روتی ہیں ننداسی آنکھیں
لوریاں روٹھ گئیں، پیار بھری بات گئی
صبح آتی ہے تو کہتی ہیں نگاہیں اُٹھ کر
کس لیے دن کا اُجالا ہوا کیوں رات گئی)
(روشنی لائے جو کوئی تو کہاں سے لائے
شامِ غم بھول گئی صبح خوشی کا رستہ
کھوئی کھوئی سی نگاہوں میں چمک ہے پھر بھی
اب بھی تکتا ہے کوئی جیسے کسی کا رستہ
پاؤں کانٹوں میں ہیں تاروں پہ نظر ہے اے دوست)

شہاب جعفری

تلاش

(نذرِ یاسمین)

رستہ یہ جانا پہچانا ہے! ــــــ کبھی یہ اپنا ہوتا تھا
برسوں برس تک، اِس اَن چھُو پر، پیار ہمارا سنجوتا تھا
سانجھ سویرے اَن دیکھی برکھا سے نم رہتی تھی خاک ــــ
شام کا غنچہ، صبح کا سورج، شبنم سے منھ دھوتا تھا
خاک سے تیرے بدن کی خوشبو ڈالی ڈالی اُڑتی تھی
دھیان کا بھونرا پھول کی بکھری پنکھڑیوں کو پروتا تھا
سوچ کی اُٹھتی گرتی لہریں تجھ کو کہیں سے لے آتیں
ساحلِ نور پہ تیرا سایہ بیٹھا پاؤں بھگوتا تھا
اک ماندی سی لہر اچانک ــــ تیری گود میں جا گرتی
دھرتی سے آکاش تک اک آغوش کا عالم ہوتا تھا
سوتی رات کا جادو چلتا، کھنچتے ہوئے دامن کی اوٹ ــــ
چاند کا جوبن چھلکا پڑتا، ساگر پیاسا ہوتا تھا
گیسو تیرے بکھرے جاتے، پہلو تیرے کھُلے جاتے
شوق کی آنکھیں لوری دیتیں، تیرا حجاب نہ سوتا تھا

سبزہ سبزہ نیند بچھی تھی، چاند کی سی رفتار سے ہم
ہولے ہولے پانو اٹھاتے، خواب کا عالم ہوتا تھا
جانے کون سے موڑ پہ تیرا ہاتھ اچانک چھوٹ گیا
گیان کی اس بورائی پون میں دھیان بھی تیرا ٹوٹ گیا

اپنی وہ دھرتی سارے جہاں میں پھر نہ کہیں پہچان ملی
اُس مٹی کی خوشبو پانے، بیج اشکوں کے بوتا تھا
چہرہ چہرہ وحشت ٹھہری آنکھیں تجھ کو بھول گئیں
مورت مورت چپ سی لگی تھی، جانے مجھے کیا ہوتا تھا
چڑھتے چاند کی آہٹ سُن کر نگری نگری میرا چراغ
رات کی جھجکتی بدلی کے دامن کو پکڑ کر روتا تھا
رستے رستے بکھری ہوئی تھی میرے چراغ کی تنہائی
اک ماندی سی لو میں کس کس کی پرچھائیں سموتا تھا
رستہ چلتے لوگ بھی پاگل اُمیدوں کو سمجھاتے
کتنا ہی آئینہ دکھاتے تیرا عکس نہ ہوتا تھا
دل کے دل بادل جب تیرا اُپر سا دے کے چلے جاتے
دور کہیں اک ابر کا ٹکڑا جیسے مجھ کو روتا تھا
ہوش کے بجھتے دیے میں اب تک اُس کا آنسو جلتا ہے
اب تک اس کی کھوج میں پگلا دیس بدیس نکلتا ہے

سورج کا شہر

"نہیں! —— یہ سورج کے شہر کا آدمی نہیں ہے،
کہ یہ تو مرنے کے بعد فٹ پاتھ پر پڑا ہے،
یہ لاش ہم سب کی طرح سورج کے ساتھ گردش میں کیوں نہیں ہے!!
پڑھو تو۔ اس ڈائری میں کیا ہے:"

بچے کھچے اک ورق پہ کچھ یوں لکھا ہوا تھا:

"میں اپنی دنیا کے نکر دفن تج کے آج بن باس میں پڑا ہوں
ہنر زدوں میں گھرا ہوا ہوں۔
یہاں تو دو اور دو کا حاصل ہمیشہ ہی چار ہاتھ آیا —— کہ پانچ ناممکنات میں ہے۔
عظیم فنکار کا قلم ہو کہ کارخانے: —— کسی کو تخلیق حسن کی آرزو نہیں ہے۔
مقدس آگ ان کے دل کی یوں پیٹ کے جہنم میں جل رہی ہے
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں، وہ خود کو زندہ ہی رکھنے میں صرف ہو رہی ہیں۔
مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں
رگوں میں جیسے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے۔
مشین کی طرح پانو چلتے ہیں۔
آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے۔

ارادہ و اختیار اک اضطرابِ سنگیں ہے، جس سے بچ کر
کوئی نہیں، دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رُک کے بات کر لے۔
(کسے خبر ـــــ؟ آدمی کے دو میٹھے بول کو میں ترس رہا ہوں!)"

یہاں یہ تحریر آنسوؤں سے مِٹی ہوئی تھی ـــــ اور اُس سے آگے:

"یہ شہر، سورج کا شہر ہے، اِس کے روز و شب کا پتہ نہیں کچھ
نہ آج تک وقت اور تاریخ کا مجھے علم ہو سکا ہے
کہ میرے احساس میں کوئی آج ہے نہ کل!
اور یہ رات ہے یا سیاہ سورج!؟
غروب ہو کر بھی آسمان و زمیں سے پیہم گزر رہا ہے!!
بس اس جہاں میں ـــــ سیاہ و روشن ـــــ ہمیشہ دن ہے،
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پہ کھڑا ہوا ہے۔
یہ کائنات اک شکستہ گاڑی ہے، ایک پہیئے پہ چل رہی ہے
(زمین کا چاند، کیا خبر، کس اَننت پاتال میں پڑا ہو!)
ہر ایک شے بھاگتی ہوئی ایک دوسرے کی تلاش میں گم ـــــ
بس اک تصادم!
ہر ایک شخص ایک دوڑتی لاش ہے ـــــ کہ اک دوسرے سے دہشت زدہ، گریزاں
سب اپنا سورج سے منہ چھپائے، تلاش میں وقت کی ہراساں
کسی کو اتنی بھی شام ملتی نہیں ـــــ کہ تھوڑا اُداس ہو لیں۔"

یہاں پہ جملے عجیب سے تھے ـــــ لہو کے دھبوں سے مِٹ گئے تھے!

(غریبِ شہر کی ڈائری سے)

تسخیرِ فطرت کے بعد

ہَوا، اے ہَوا — !
میں ترا ایک انگ ایک لہرا تھا
صدیوں ترے ساتھ دشت و دَمن، کوہ و صحرا میں
آزاد و سرشار پھرتا رہا ہوں
سمندر کی چھاتی پہ صدیوں ترے ساتھ
بدمست و بے فکر چلتا رہا ہوں
اَن دیکھی زمینوں، طلسمی جزیروں کو دریافت کرتا رہا ہوں

مجھے تو نے فطرت کے مَعبد،
صنم خانۂ کائنات، آذری کے طلسمات سے آکے باہر نکالا
مرے خوف سے کانپتے دل کو،
وہموں سے لبریز، اوندھے ہوئے کاسۂ سَر کو
سجدے سے تو نے اٹھا کر
انھیں آگہی و عمل کا نیا نور بخشا
مجھے خود سے اور خود کے باہر مظاہر سے
صدیوں ہم آہنگ و ہم رُتبہ ہونا سکھایا۔

سمندر کے دُکھ کو سمجھنے کی خاطر

اُبلتے ہوئے گرم، پُرشور طوفاں کو مجلو سے ناپا ہے میں نے
بیاباں کی تنہائی کو دور کرنے کی خاطر
میں تپتی ہوئی ریت پر صدیوں پیاسا ہی پیدل چلا ہوں
بدلتے ہوئے موسموں کا فسوں توڑنے کو شب و روز میں نے
بہار و خزاں میں، درختوں کے سایوں سے پتّوں کی سانسیں گنی ہیں
زمانے کا ہر سرد و گرم آزمانے کو صدیوں ہی تک میں
پہاڑوں کی برفیلی چوٹی سے
جوالا مُکھی کے دہانے سے گزرا گیا ہوں
اور اس پر بھی جب ناتمامی کا احساس ڈستا رہا
اپنی تکمیل کرنے کی خاطر
ستاروں کی پُرنور چوکھٹ کو چوما ہے
دھرتی کے تاریک غاروں میں خود کو پکارا ہے میں نے
غرض زندگی کے ہر اک درد سے خود کو انگیز و دمساز کر کے

ہوا، اے ہوا ــــــ؟
میں کہ تجھ سے بچھڑنے سے پہلے
تری طرح آزاد و سرشار تھا
اب یہ کس طرح کی منہمک، ٹوٹتی زندگی ہے؟
کہ تو شہرِ آگہی کی تنگ و تاز سہنے کے قابل نہیں
اور میں شہر شہر ایک پتھر سا، اَن پُتھ، پہ بے حس پڑا،
اب تری سُست پیمائی اور اپنی بے چارگی کا،
یہ کس سے گلہ کر رہا ہوں!؟

"ریناساں یاترا" کا پشاچ ناچ

(اکیسویں صدی قبلِ مسیح کے استقبال میں)

ماہ مَنی ملیانہ · میرٹھ
تیرٹھی نت تت · رایٹ گھٹ گھٹ
ٹپٹ پاؤن · میرٹھی رایٹ!

منگل پانڈے : ——— گائے کی چربی
غزنی نہیں · اب کے ہے یہ غزنی
ناگی گئے · ملیچھوں سے ہے ڈربی
جنرل بخت کے گھونپ یہ ترشول!
دوڑالے رتھ کھان کو ہرٹ ! !
ماہ مَنی · ملیانہ · میرٹھ
میرٹھی تت تت · رایٹ گھٹ گھٹ
ٹپٹ پاؤن · میرٹھی رایٹ!

رانی جھانسی لکشمی بائی
کہاں سے حضرت محل اُگھرائی!
بھاگے نہ کشمنڈ دیہ لگائی

اِس سُوتن کو شُدھی کر دے!
مین اِسٹریٹ پہ دھر دے چھپر کھٹ!!
ماہ مئی، ملیانہ، میرٹھ
میوٹنی تٹ تٹ، رایٹ گھٹ گھٹ
ٹپٹ پاؤں، میوٹنی رایٹ!

دیش بھگت ہیں سراج اور ٹیپو؟
پہلی تلوار اِن کی؟ — اُخ تھو!
دونوں بول رہے ہیں اردو!!
نانا راؤ جی — لینا اِن کو!
جے شِو سینا، جے آنند مٹھ!!
ماہ مئی، ملیانہ، میرٹھ
میوٹنی تٹ تٹ، رایٹ گھٹ گھٹ
ٹپٹ، پاؤں، میوٹنی رایٹ!

ویدک راج اور سیکولر راجا؟
"باسی بھات، خدا کا ساجھا" ؎
بکری چاہے شیر کا کھاجا؟
تو کی بھاشا چھان کے بولو!

؎ اسی عنوان سے ٹھیک میرٹھ کے فسادات کے دنوں میں ہندی رسالہ "ہنس" میں اردو زبان و کلچر کے خلاف ہندی کے ایک بڑے سیکولر، پرگتی شیل، کمیونسٹ ودوان ڈاکٹر نامور سنگھ کا زہر بھرا مضمون، جو ہر زبان کے دانشوروں کے لیے آگ پر تیل تھا۔ (ش ج)

خسروؔ، غالبؔ، کوڑا کرکٹ!!
ماہ مئی، ملیانہ، میرٹھ
میوٹنی تٹ تٹ، رایٹ گھٹ گھٹ
ٹمٹ پاؤن، میوٹنی رایٹ!

نرگسؔ؟ — دینِ الٰہی؟ — ایکتیٰ!
کبیراؔ؟ — اکبرؔ؟ — ٹھگوے ہیں بھئی!!
دیش تھا آریہ رتھ — دُھری کیکئی
دھرم تھا چار لگام کا چیتک!
ڈھونگی نہروؔ کر گیا چوپٹ!!
ماہ مئی، ملیانہ، میرٹھ
میوٹنی تٹ تٹ، رایٹ گھٹ گھٹ
ٹمٹ پاؤن، میوٹنی رایٹ!

گوتم کی سدھ، عیسیٰ کی چھو
چشتی اور نانک کی خو بو
ایک بھی پاؤن بچا نہ ہندو
گاندھی جی! — گوڈسے کی دہائی!!
آریوں پر تم سے ہے سنکٹ!!
ماہ مئی، ملیانہ، میرٹھ
میوٹنی تٹ تٹ، رایٹ گھٹ گھٹ!!
ٹمٹ پاؤن، میوٹنی رایٹ!

کہت کبیر ــــ اَوگنی ہیں پانچو
اَلکھ الٰہی، اب نہیں جانچو
نِرگُن تیاگو، سَگُن یہ باچھو

اِیشر بربجن، اللہ ہربجن،
دھوئے روگ نگا، کا پنچھو دوکپٹ
اکیسویں صدی ہوئے دوتلپھٹ
اب مورے پانچوں تُشٹو کو اَونگھن
پھیر موری چدری رام اور رحمن!
اچھوت، اپاؤن ــــ مت چھو ــــ چل ہٹ!!

(بھوجپوری)

وندنا

(کرانتی کال کی)

دل ٹوٹا اب ناہیں جُڑی
ہے بھگوان ہری
توری پوجا ناہیں کرب ہم
سنو کھبر ہے بُری
اب ہم کہبے کھری کھری
ہے بھگوان ہری

نا تورے اَنتر نا مورے انتر
تمہُو پاتھر، ہمُو پاتھر
ہمرے تورے بیچ اب چاہے چلے کٹار چھُری
تو سے کون ڈری
ہے بھگوان ہری

کھیت کی کھاتر کال کی ڈائن دھرتی کو بھی پرجا
کھیت کے چلتے مائی باپ ہو گئے! مائی کو نہیں سوجھا
کھیت کا سونا پیٹ کا گہنا، پہنت ہے کوئی دوجا

مات پتا سب سوڑ پر چڑھ گئے
کھیت نہ ہوئے ہری
ہے بھگوان ہری
مالی جھاڑ کے کھیت سے بھاگے بکر کھانے کے منڈ
بیٹیا گھوما، سیس نوایا ـــــ لوہا دھاڑے ہر ہر
یہاں بھی روٹیا الکھ نرنجن
بھکشو ہم بھر تری
یہاں بھی بیٹیا راجا اندر
ہم بلوان دُھری؟
یہاں بھی تیری جادوگری
رے بھگوان ہری
چلے کٹار چھری
دیکھیں کون مری

صادق

ایک وصیت

دونوں ہاتھوں میں ننگی تلواریں سونت کر
میں اندھیرے پر ٹوٹ پڑا
اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہا
لیکن اُس نے میرا ہر وار خالی کر دیا۔
میں نے ہاتھ میں بندوق اٹھالی
اور اس پر دیوانہ وار گولیاں برسانے لگا
سوچا تھا' اس کا جسم چھلنی کر ڈالوں گا
لیکن اس میں ایک بھی سوراخ نہ کر سکا۔
پھر میں نے مشعل اٹھالی
اور ایک زبردست ارادہ لیے آگے بڑھا
چاہا تھا اس کا چہرہ جھلس دوں گا
اور اسے زندہ جلا کر راکھ کر دوں گا
مجھے یوں بپھرا ہوا دیکھ
اندھیرا سہم کر پیچھے ہٹ گیا
لیکن دوسرے ہی لمحے
اس نے زور سے پھونک مار کر مشعل بجھا دی

پھر میں نے ایک اور منصوبہ بنایا
چپکے چپکے ایک سُرنگ تیار کی
لیکن مجھے گمان بھی نہ تھا
کہ ڈائنامائٹ کے فیتے کو آگ دکھانے سے پہلے
اندھیرا سرنگ میں پانی بھر دے گا

آج میری رخصت کا وقت آ پہنچا ہے
لوگو!
جب کوئی نوجوان، اندھیرے کو للکارے
تو تم، اسے میری مثال نہ دینا۔

maablib.org

الفاظ کی ولادت

اُس نے
رستے جوگی کے آگے
روٹیاں رکھ دیں
اور بہتے پانی کے سامنے
ایک دیوار کھڑی کر کے
فاتحانہ انداز میں کہا :
دیکھو ! میں نے دونوں کو روک دیا ہے
اور اب تمہاری باری ہے۔
یہ کہہ کر، اُس نے
میرے تمام رنگ کیچڑ میں اُنڈیل دیے

میں نے دوڑ کر قلم اُٹھانا چاہا
لیکن اس نے
میرے ہاتھوں کے پہونچے اُتروا دیے

میں زور زور سے چیخنے لگا
تو اس نے میری زبان کاٹ کر پھینک دی
اور مجھے مضبوط اندھیروں سے جکڑ دیا

سالہا سال سے
گھٹاٹوپ خاموشیاں بسر کرتا ہوا
میں دیکھ رہا ہوں
کیچڑ میں بکھرے ہوئے رنگوں کے بیچ
میری کٹی ہوئی زبان
درد سے تڑپ رہی ہے

الفاظ کی ولادت کا دن
قریب آگیا ہے

عذابوں کا شہر

یہ عذابوں کا شہر ہے
یہاں خود کو بچانے کے تمام حربے
بے کار ثابت ہوتے ہیں

جب تم سو رہے ہو گے
کوئی تمہاری ٹانگیں چرا لے جائے گا
اور جب تم اپنے پڑوسی سے
ٹانگیں ادھار لے کر
پولیس تھانے
رپورٹ لکھوانے کے لیے پہنچو گے
تو تھانے دار، رشوت میں
تمہاری آنکھوں کا مطالبہ کرے گا
جن کے دینے سے انکار کرنے پر
تم دھر لیے جاؤ گے
دماغ کی اسمگلنگ کے جرم میں

وکیل کو اپنے بازو
اور مجسٹریٹ کو ناک اور کان دیے بغیر
تمہاری رہائی ممکن نہیں

عدالت سے
باعزت رہا ہونے کے بعد
اپنے کھوئے ہوئے تمام اعضا
حاصل کرنے کے لیے تمہیں
صرف اپنا ضمیر چکانا پڑے گا۔

maablib.org

ایک بار پھر

ایک بار پھر
فقیروں کا بھیس لیے
میرے در پر
عیار آ کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ وہی تو ہیں
جو ایک بار پہلے
مجھ سے میرا نقش لے کر
ہاتھوں میں تھما گئے تھے
جنت کا ایک حسین ٹکڑا
جو ان کے جاتے ہی
دوزخ بن گیا تھا

چند سال بعد
وہ مجھ سے ایک اور نقش لے کر
اس کے بدلے
دے گئے تھے ایک سمندر

جو اس دوزخ کو بجھا سکتا تھا
لیکن ان کے چلے جانے کے بعد
وہ سمندر
طوفانِ نوح بن گیا۔

... اور آج پھر
وہ میرے در پر کھڑے ہیں
کاندھوں پر لیے ہوئے ایک کشتی
اور نقش ہاتھ میں لیے
میں سوچ رہا ہوں
کیا یہ کشتی
مجھے طوفان سے نکال سکے گی؟

madlib.org

مجذوب

میلے کچیلے
چیتھڑوں سے جھانکتے جسم میں
ارتعاش پیدا ہوا
بڑے بڑے چکٹ بالوں والا سر
تاکیدی انداز میں ہلنے لگا
اور کیچ بھرے سُرخ سُرخ دیدے
نچاتے ہوئے
وہ چلا چلا کر کہنے لگا :

جب معشوق کے لبوں نے جنبش کی
تو سخن کی ولادت ہوئی
پھر اُس سے جو شے پیدا ہوئی
وہ خواب تھا
ہر چیز کی اصل خواب ہے
یہ کائنات بجز خواب کچھ نہیں
تم اس میں کہاں آ پھنسے
معصوم گندم خور

تمہارے اور معشوق کے درمیان
ایستادہ معمّر فاصلے
تم پر انگلیاں اُٹھاتے ہیں
تمہیں ڈراتے دھمکاتے
اور غیظ و غضب دکھاتے ہیں
پھر برہنہ شمشیریں لیے
مقابل آ کھڑے ہوتے ہیں
انھیں زیر کیے بغیر تم
اُن کے معنی نہیں جان سکتے"

نادان بچّو!
تم نے خدشات کا کچّا دودھ پیا ہے
اس دودھ کے دانت
ابھی تمہارے منھ سے نہیں جھڑے

جب اپنی زبان کی تُتلاہٹ پر قابو پا لو
تو سب سے پہلے اُس لفظ سے ڈرو
جو حق نہ ہو
پھر نیام سے تلوار نکال کر
وسوسوں پر ٹوٹ پڑو
کہ یہ قدم روک لیتے ہیں

اندھیری سمتوں میں چمکتی
بے شمار طویل و مختصر خواہشیں،

احتجاج کے قالب میں آکر رجھاتی ہیں
کبھی ہم آغوش ہوتی
بستر پر بیٹھ جاتی ہیں
بدن کے طلسمات میں اسیر کر کے
سفر کو تصغر بنا دیتی ہیں۔

جب میں نے پاؤں چلنا سیکھا
تو ایک پاؤں پر جسم کو رادھ کر
دوسرے پاؤں سے
جس کو ٹھوکر لگائی
وہ زنِ فاحشہ دنیا تھی۔
جو لوٹ کر پھر میرے قدموں میں آگئی
میں اُسے جتنی زور سے ٹھوکر لگاتا
وہ اتنی ہی شدّت سے لوٹ کر
مجھ سے لپٹنے کی کوشش کرتی
یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے
سلطانِ زمن
تو تو مسندِ افلاک پر تنہا
شطرنج کھیلنے میں مصروف ہے
اور تیری سپاہ
تیرے نام پر
مصروف بر جنگ ہے
میں شطرنج کا ایک بے بضاعت مہرہ

تیرے بُنے ہوئے خواب کی ارذل مخلوق
گرسنگی اور گندم کے ذائقے کے درمیان
لمحہ لمحہ مر رہا ہوں

برسوں سے
شیخ کی زنبیل گھما گھما کر
فتوح پر بسر کر رہا ہوں

پیر و مرشد
اگرچہ تخلیق کو زنہار
خالق کی غایت نہیں معلوم
لیکن یہ مُشتِ خاک، خلیفۃ اللہ
وضو تازہ کر
بارگاہِ ربوبیت میں فریادی ہے
کہ جلتا سورج زبان پر سے اُٹھالے
مجھے کہنے دے
کہ خیر کے اعضاء مضمحل ہو چکے ہیں
اب عذاب النار کے نقشے
نکوکار ہی بنائے جاتے ہیں

تسلیم و رضا سے جی بیزار ہو گیا
قناعت کی آنکھوں میں
نیل کی سلائیاں پھروا دے
توکّل کو سنگسار کرا دے

اس سے پہلے
کہ حق باطل سے بیعت کرے
ابلیسِ لعین کو
تحت الثریٰ میں قید کردے ثریٰ جاہ
مبادا یہ شریر و سرکش، راندۂ درگاہ
اک دن تجھے معزول کردے

میں، آسمان کے کنارے کھڑا
اک خواب کے جلنے کا منظر دیکھ رہا ہوں
کور چشم دیدہ ور
دوش پر حقیقت کا جنازہ لیے
خانقاہ کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے ہیں
صدائے بین و بُکا سُن کر
مجاز کی آنکھیں چمک اُٹھی ہیں
اُسے یمین و یسار میں
اپنے ہی چہرے نظر آرہے ہیں
میری آنکھوں میں وحشتیں ناچ رہی ہیں
جو ہنسی کو دریا میں ڈبویا چاہتی ہیں

.... اور ایک سراب
میرے حلقوم میں اٹک رہا ہے
ایک حقیقت
ذہن کے گنبد میں گونج رہی ہے

میں نور کی جستجو میں
گور کی ظلمت سہہ لوں گا
لیکن حرفِ شکایت زبان پر لانے کے بجائے
ہر بار چیخوں گا
مجھے قطع من الغیر کا حوصلہ دے یارب
یہ مجاز، یہ خواب، یہ سراب
ترک ترک ترک
بگیر بگیر
اللہ نگہبان

maablib.org

عتیق اللہ

میں سُن رہا ہوں

میں سُن رہا ہوں
تمہاری آنکھوں کا شور
تمہارے مساموں سے بوند بوند ٹپکتی ہوئی آوازیں
تمہاری چھاتیوں کی نیلی نیلی لکیروں کے درمیان
کنمناتے ہوئے بچّوں کی سرگوشیاں

پلک جھپکتے ہی
شہر کا شہر ہجرت کر گیا
پڑاؤ ڈال دیے گئے وہاں
جہاں کوئی موسم نہیں ہوتا
درخت پرندوں سے خالی
بچّوں کو نیند نہیں آتی
کچھ رونما نہیں ہوتا

چیونٹیوں نے اپنے معمول بدل دیے ہیں
رسول آتے ہیں اور بے بیان چلے جاتے ہیں
خدا کی بستیاں کبھی اتنی ویران نہیں ہوئی تھیں
اب تم آؤ گے
تو دیکھو گے۔
وقت،
جہاں تہاں سے پھٹ گیا ہے
اسے اپنی راہ پر لانا
کتنا آسان ہے، کتنا مشکل
کتنا مشکل ہے
ان ساعتوں پر کمندیں ڈالنا
جنھوں نے موقع پا کر اپنی رفتار پکڑ لی
دیکھتے ہی دیکھتے
دوسری آبادیوں کی طرف نکل گئیں

بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر میں
تسلیاں منھ بسورے ہوئے پڑی ہیں
املتاس کی سوکھی شاخوں پر
ٹنگے ہوئے ہیں صبر کے چیتھڑے
پرندوں میں بدل چکے ہیں
آرزوؤں کے بے پایاں تسلسل
ڈھ چکے ہیں
اندر ہی اندر شیر خوار امیدوں کے ٹیلے

جنھیں دیکھ کر
تمہیں یاد آئے گا
رشتوں کے بھرم کتنے سفاک ہوتے ہیں
کتنے پُر زور ہوتے ہیں واسطے
جو ٹوٹتے ہیں
تو اُن میں سے ایک چیخ بھی برآمد نہیں ہوتی
سارا جہان ہی ٹوٹ، بکھر جاتا ہے
گردش کرتے ہوئے خون میں
برف کی کیلیں گڑھ جاتی ہیں
جیسے سارا جسم ہی آگیا ہو
کسی سرکش آندھی کی زد میں
اور ایک ایک کر کے
ہڈیوں کے سارے جوڑ ہی کھلتے جا رہے ہوں
بکھرتے جا رہے ہوں سارے مسام
گرتے جا رہے ہوں
ہم ان چوہڑوں پر
جہاں صرف خوابوں کے بیج بوئے جاتے ہیں
اور فصل کے نام پر
حافظے کے عذاب نمو پاتے ہیں
جیسے ہم ایک عظیم ہجر کی پیداوار ہیں
عمریں دکھوں کے حساب سے طویل
دُکھ ــــــ دشمن کی بیدار نگاہوں سے زیادہ زندہ

اپنے کاندھوں پر
اپنی سانسوں کے خمیازے ہیں
اور میں؟
اپنی ہی نیندوں میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا ہوں

maablib.org

ابّا کے نام

اس لمحے
کہ تم میرے ساتھ ہو
خدا میرے نزدیک ہے
میں اس کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہوں
اپنی کمیوں، بدنصیبیوں اور بے وقوفیوں کو بھول کر
اُس کے شفقت بھرے ہاتھوں کا لمس
اپنی پیٹھ پر محسوس کرتا ہوں

دیکھتے دیکھتے
ہرا بھرا درخت بن جاتا ہوں
جیسے
میں ایک نہیں، کئی زندگی جی رہا ہوں
جیسے
میں ایک نہیں، کئی اشیا میں بدل گیا ہوں

چھوٹے سے چھوٹے ذرّے میں

کائنات کی کائنات سرسراتی ہے
تمام راستے
مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
لگتا ہے
تھوڑی دیر کے لیے زمین رُک گئی ہے
لوگوں نے
اپنی نفرتیں
اپنی جیبوں میں بھر لی ہیں
اور مجھے
خوش آمدید کہہ رہے ہیں

maablib.org

ہمارے مابین

ایک خواب سے جب تم دوسرے خواب میں قدم رکھو
تو یہ خیال رہے
ایک زمین تمہارے اندر بھی اپنے لیے زمین بنا چکی ہے
جس پر ہزاروں
ننھی ننھی دعاؤں کی بالیاں پھوٹیں گی
تم اُن دعاؤں کی زبان سمجھنا
اُن لفظوں کو سُننا
جنھیں تم نے
سفر کے گزشتہ مرحلے میں اِدھر اُدھر گما دیا تھا

یہ دنیا
محض ایک فاصلے کا نام ہے
اور
تمہارے پاؤں تو بہت چھوٹے ہیں

ذرا مڑ کر دیکھو

تم اپنے خدا کو کہاں چھوڑ آئی ہو
تمہاری نمازوں کا نور کہاں رہ گیا ہے

دیکھو
ہمارے مابین
ایک دلدل ہے
اور اس دلدل میں
ایک چاند پھنسا ہوا ہے
جو تمہارے قدم ناپ رہا ہے

میں کہ تم پہ باز ہوں

جہاں کہیں سے تم نے اپنے فاصلے اُٹھا لیے
وہیں سے میری ابتدا ہوئی
سینکڑوں نحیف اور نزار ہاتھ
آسمان کی طرف اُٹھے
اور ایک ساتھ اُٹھ کے میرے چاروں سمت
کئی صفوں میں تن گئے

میں تمہارے واسطے
تمہارے نام سے
ایک ایسے باب کے دہانے پر کھڑا ہوں
جو ہزاروں سمتوں کو رجوع ہے
میں کہ تم پہ باز ہوں
خدائی کی سب خدائی تم پہ باز ہے
تم مری طرف جھکی رہو
جھکی رہو
کہ اس کے بعد میرے اور تمہارے جسم کی
بامراد شرکتوں سے ایک تن درست شہر کی اُمید ہے

وہ

اُس میں کتنا گھریلوپن ہے۔ اُس کی سانسوں میں نور ہے اور چھاتیاں دُودھ سے بھری ہیں۔ اُس کی روشن سیاہ آنکھوں کے پلنے میں دوسرا مرد سو رہا ہے۔ میں جس کی سانسوں کے شور سے بار بار اُٹھتا ہوں، دیکھتا ہوں تو میرے نزدیک صرف وہ ہے۔ سوائے اُس کے کوئی نہیں ہے۔ وہ میرے گھر میں ہے اور کس درجہ اجنبی ہے۔ ابھی اُسے اُٹھ کے دور جانا ہے۔ جسم دھونا ہے۔ اپنے بچّوں کو دیکھنا ہے۔ صفائی کرنا ہے۔ جھوٹے برتن بھی مانجھنے ہیں۔ اپنے آقا کے ساتھ پھر ساری رات مرنا ہے۔

عرش ملسیانی

چاند سے شکایت
(بے عطف و اضافت)

کس کو اپنا رنج بتاؤں کس کو حال سناؤں میں
کون انھیں دیکھے گا کس کو دل کے داغ دکھاؤں میں
غم کی آگ جلاتی ہوں میں دل کے آتش خانوں میں
اپنا حال سناتی ہوں میں سوز بھرے افسانوں میں
اب وہ دل میں شوق نہیں ہے اب وہ دل میں جوش نہیں
ایسا حال ہوا ہے میرا مجھ کو اپنا ہوش نہیں
آنکھ میں آنسو، لب پر نالہ، دل میں داغ محبت کا
سوز بہت ہے، رنج بہت ہے، درد بہت ہے فرقت کا
پہلو میں اک دل ہے لیکن ہے مجبور مچلنے سے
دل میں ایک فغاں ہے لیکن ہے معذور نکلنے سے
ایک گلہ ہے، اک شکوہ ہے ایک شکایت کرتی ہوں
دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر درد سے آہیں بھرتی ہوں
میں تو اک ناکام بھی ہوں مجبور بھی ہوں لاچار بھی ہوں
تنگ بھی ہوں اس دنیا سے اس جینے سے بے زار بھی ہوں
تجھ کو، مگر اے چاند بتا دے، مجھ پہ ہنسی کیوں آتی ہے

دل کی سب اُمیدوں پر تاریکی یاس کی چھائی ہے
رُوح شگفتہ کیوں کر ہو جب دل کی کلی مُرجھائی ہے
کیا معلوم ہے پاپی من کب رنج کی قید سے چھوٹے گا
آئے گی کب موت مجھے کب تار نفس کا ٹوٹے گا
دل میں اک فریاد ہے لیکن اس میں بھی خاموشی ہے
اُلفت کی پُر شوق اُمنگوں میں بھی اک مدہوشی ہے
سینے میں اک سوز نہاں ہے سوز بھی ہے وہ اُلفت کا
تیر لگا ہے ایک جگر میں تیر بھی ہے وہ فرقت کا
آہ میں ہے اک بجلی ایسی ضبط کا خرمن خاک ہوا
درد میں ہے اک وحشت ایسی صبر کا دامن چاک ہوا
اور کسی کو دنیا میں مجھ دکھیاری کا پاس نہیں
اور کسی کو دنیا میں اِن باتوں کا احساس نہیں
روتی ہوں رو رو کے اپنے دل کی آگ بجھاتی ہوں
میں تو اپنی بے چینی سے اپنا جی بہلاتی ہوں
تجھ کو مگر اے چاند بتا دے مجھ پہ ہنسی کیوں آتی ـــ

ایشیا کو چھوڑ دو

خون چوسا جان لی اب جسم بھی کھاتے ہو تم
اے سیاسی کرگسو کیوں ظلم فرماتے ہو تم
ایشیا کے غم میں کیوں دُبلے ہوئے جاتے ہو تم
اب بلا سے کچھ بھی ہو تم نے تو گھر کو بھر لیا، کام اپنا کر لیا
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

بن کے تاجر حرص کا دامن بہت پھیلا چکے
تیل بھی تم پی چکے اور کوئلہ بھی کھا چکے
کوئلہ کھا کے ہم پر آگ بھی برسا چکے
اب تو گھر کی راہ لو، چھوڑ دو یہ جنگ زرگری، ایشیا کی رہبری
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

بے کسوں کے غم میں مرنے کے لیے تیار ہو
سادگی کا روپ بھرنے میں بڑے پُرکار ہو
گمراہوں کو راہ پر لانے کے ٹھیکیدار ہو
اہلِ مشرق کے لیے یہ جاں فشانی کس لیے، سرگرانی کس لیے
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

تم نے پھیلایا ہزاروں سال ہمدردی کا دام
تم نے صدیوں تک مچایا شورِ بہبودِ انام
تم نے قرنوں تک لیے جاہل غلاموں کے سلام
اب بھی تم ان کی حفاظت کے لیے مجبور ہو' کس قدر معذور ہو
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو' ایشیا کو چھوڑ دو

رہزنی کے آج تک باقی ہیں یہ انداز کیوں
ہر گھڑی تازہ ہے اب بھی رسمِ حرص و آز کیوں
کر رہے ہو ایٹمی طاقت پہ بے جا ناز کیوں
ان گناہوں پر بھی عذرِ بے گناہی کس لیے' یہ تباہی کس لیے
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو' ایشیا کو چھوڑ دو

کوریا' جاپان' انڈونیشیا ہو یا سیام
فارموسا' مشرقِ وسطیٰ' ملایا' ویت نام
ان میں اب کوئی نہ مانے گا تمھیں اپنا امام
چھوڑ کر جھوٹی امامت کام اپنا کیجیے' اِن کو جینے دیجیے
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو' ایشیا کو چھوڑ دو

سازِ خاموشی

فلک پر انجم تاباں تھے مصروفِ درخشانی
برستا تھا زمیں پر آسماں سے نور کا پانی
شعاعیں اپنا سیمیں جال دُنیا پر بچھاتی تھیں
در و دیوار پر پڑ کر طلسمِ شب مٹاتی تھیں
کچھ ایسے اوڑھ رکھی تھی فضا نے نور کی چادر
گماں ہوتا تھا جس پر یہ کہ ہے بلور کی چادر
لیے ہاتھوں میں نیزے چاند کی کرنیں جھپٹتی تھیں
سیہ پوشانِ تاریکی کی ہر صف کو اُلٹتی تھیں
سیاہی کا کہیں اشجار کے سائے میں ڈیرا تھا
کہیں تاریک غاروں میں ملا اُس کو بسیرا تھا
جو منظر تھا وہ سیمیں تھا جو نظارہ تھا سیمابی
منانے کو تھی فطرت آج گویا جشنِ مہتابی
بڑھے آتے تھے لشکر نور کے، کرنوں کی فوجیں تھیں
سمندر زور پر تھا اور طوفاں خیز موجیں تھیں
زمیں پر آسماں پر کوہ پر وادی پہ دریا پر
چمن پر، شہر پر، بستی پر، ویرانے پہ، صحرا پر

مساجد اور مندر، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں پر
غریبوں کے گھروں پر اور امیروں کے مکانوں پر
سمندر کے کناروں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر
جہازوں کے نشانوں کشتیوں کے بادبانوں پر
غرض ہر جسم پر ہر چیز پر تھا نور کا عالم
جہاں کے ذرّے ذرّے پر تھا برق طور کا عالم
نظر کے سامنے تھا اس طرح نظارۂ فطرت
کہ فطرت جھولتی ہے آج خود گہوارۂ فطرت
فلک نقاشیوں کے رنگ جب فطرت میں بھرتا تھا
میں ان نقاشیوں میں جستجوئے شعر کرتا تھا
مناظر دیکھ کر میں ہو رہا تھا محو مدہوشی
مرے کانوں میں آتی تھی صدائے ساز خاموشی

maablib.org

عمیق حنفی

لخت لخت

یہ ٹکڑے، یہ ریزے، یہ ذرّے، یہ قطرے، یہ ریشے
یہ میری سمجھ کی نفیس کے پادان
انھیں جوڑتا ہوں تو کوئی بدن
نہ کوئی صراحی، نہ صحرا، نہ دریا، نہ کوئی شجر، کچھ بھی بنتا نہیں
لکیروں سے خاکے ابھرتے ہیں لیکن
یہ کوشش مٹائی ہوئی صورتیں پھر بناتی نہیں
کہ وہ جان جس سے یہ سارا جہان
حرارت سے، حرکت سے معمور تھا، اب کہاں ہے؟
میری عقل نے سرد آہن کے بے جان ٹکڑوں کو آلات کی شکل میں ڈھال کر
مرے توڑنے جوڑنے کے عمل میں لگایا
جلا کر ہر اک جسم کو، پھونک کر جان کو، راکھ سے اپنی زنبیل بھر لی
تو اس راکھ سے کیسے وہ صورتیں پھر جنم لیں
جنھیں وقت نے اور میں نے مٹایا!

پسِ دیوارِ شب

نیم شب میں عیشِ بستر چھوڑ کر
کون میرے پیچھے پیچھے آئے گا
اور دیکھے گا کہ میں
ایک غیر آباد مسجد میں
چند انجانے بزرگوں کی جماعت میں
تہجد پڑھ رہا ہوں

کون دیکھے گا رجال الغیب مجھ سے
بات کرنے میں مگن ہیں

چاند کو باہر فلک پر چھوڑ کر
وقت کی اندھی گپھا میں
دور تک اندر پہنچ
آگ کے اور روشنی کے آبشاروں میں نہاتا ہوں
اور اسی رستے سے باہر آن کر
چاند کی گردن میں اپنا ہاتھ ڈالے
انجمن تا انجمن آوارگی کا لطف لیتا ہوں
نیم شب کو عیش بستر چھوڑ کر

جنگل

(ایک ہشت پہلو تصویر)

شہر کے کارے چلاتے، بے مزے، بدرنگ، شور و غل، سے دور
پاک رنگوں کا صنم آباد
پاک آوازوں کا اک گندھرو لوک
شہر والوں میں ہے جنگل جس کا نام
صبح جس کی ایک ارژنگ اور البم جس کی شام

وہ چھلکتی فصل کے پہلو میں کہنی مار کر کلکاریاں بھرتی ہوا
جھن جھنا اٹھتے ہیں موٹے، چم چماتے تار
ٹیپ پر جاتی ہے بل کھاتی ہوئی آواز
چھڑ گئی ہو دور جیسے جل ترنگ
دوڑتی ہے سنسنی ایسی امنگ
جیسے پانی میں ہزاروں مچھلیاں اک ساتھ کودیں اور چادر چیر جائیں
جیسے چکنے کام والی ساڑیاں لہرائیں، سرسر سرسرائیں
گن کنائیں جیسے ہنسوں کے ہجوم
گن گنائیں سرمدی نغمے نجوم

وہ سنہری چولیوں میں کسمساتے، گول ابھرے سانولے ٹیلے

گول ابھرے سانولے ٹیلے، سنہری، تنگ، روشن چولیاں
کسمساتے گول اُبھرے سانولے گدرائے بھاری سخت ٹیلے
وہ سنہرے پن کویاں واں پھاڑ کر خود پھٹ پڑا ہے شیام رنگ
بار سے ہے چاک چولی جھانکتا ہے سانولی دھرتی کا رنگ
(یاد آتا ہے یہاں تشبیہ کا سمراٹ کالی داس)

وہ کھجوروں کے درختوں کی قطار اندر قطار
ایک دم سیدھی کھڑی، سمبندھ ریکھائیں زمین و آسماں کے درمیاں
آسمانی شامیانہ ان ستونوں کے سروں کو چھوڑ کر
بے ستوں گنبد سا خود لٹکا ہوا

آم کی ڈالوں پہ چکنے سبز پتے
سبز پتوں پر لٹکتی کیریاں
سبز ننھی کیریاں
رنگ، رس اور سواد کے خوابوں کی تعبیروں کے انکھوے کھل گئے

سبز پیلا، سبز بھورا، سبز کالا، سبز زریں، سبز نیلا
سبز چنبز، سبز سبز
سبز غالب رنگ کتنی جوڑیوں کے ساتھ ہے پھیلا ہوا
سبز غالب رنگ، باقی رنگ گویا اس کے شیڈ
راس منڈل میں کنھیا سبز، باقی رنگ اس کی گوپیاں

تیز بے حد تیز، بے دم، ہانپتی موج ہوا کی لے

تیز بے حد تیز لیکن نغمہ ریز
جھومتا، گاتا، تھرکتا، ناچتا ماحول
ایک لَے میں رقص کرتے ہیں فضا، دیہات، جنگل، کھیت
رقص میں ہے موجِ رنگ
موج میں آواز
اور پھر آواز میں خوشبو کا رقص
سب کے سب ہیں ایک لے کے دائرے میں ہم نوا، ہم رقص باہم ایک
دور تک پھیلاؤ، آزادی، محبت اور چنچل شانتی
ایک جیتی جاگتی تابندہ زندہ شانتی
پھولتے پھلتے، سنورتے، کر گزرنے کا کھلا امکان

شہر والوں میں ہے جنگل جس کا نام

maablib.org

موت میری جان موت

موت میری جان موت
تو بڑی مدت سے میری تاک میں ہے
زندگی ممتا بھری ماں
اور تو اے موت اک معشوقۂ وا آغوش

ریت اور پتھر ہزاروں سال ہم بستر رہے لیکن
گھاس کی پتی بھی پیدا کر نہ پائے
زندگی اور یہ زمانہ بھی بڑی مدت سے ہم آغوش ہیں
خیر، اس قصے کو چھوڑ کر

دیکھ
ریچھ کے پیروں سا دستِ سود خوار
اپنے ٹیڑھے میڑھے ناخن
یا تری وحشی نگاہ
میرے سینے میں گڑ دئے جا رہا ہے

آنکھ
خلوت کی جھلستی ریت پہ

آب پاش
اور تپتی ریت سے
کوئی کونپل
کوئی رنگ
کوئی خوش بو
کوئی شے اٹھتی نہیں
ایک بھورا پن
خلوتِ بے رنگ کو بدرنگ کر جاتا ہے بس۔

روشنائی خشک، نب ٹوٹی ہوئی، کاغذی آنکھیں نم
دیمکوں کا گھر دماغ
اور میری تاک میں تو
کیوں رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے یہ سیاہ احساس
لمحہ لمحہ ختم ہوتا جا رہا ہوں
آنکھ سے ٹپکے ہوئے اشکوں کے ساتھ
قطرہ قطرہ ختم!
نقطہ نقطہ ختم!
چھ تبسّم قرض لے کر
سود میں اپنے بدن کا گوشت ادا کرنے کے ہر وعدے کے ساتھ!
ختم ہوتے جا رہے مجھ کو اگر پا بھی گئی تو کیا کرے گی
موت میری جان موت

دُعا

ان گنت شمسی نظاموں کے بکھیڑوں سے اگر
اک ذرا فرصت ملے تو
میری آنکھوں کی نمیدہ کور پر اشکِ ندامت کی طرف بھی دیکھ لینا
جھلملایا اک ستارہ جیسے استغفار کا کوئی وظیفہ

یہ زمیں
تیری مخلوقات کا ادنیٰ سا ذرہ
اور اس ذرّے کا میں جزوِ حقیر
میرا حصّہ نبضِ معنی کی خوش آہنگی میں لفظوں کو نچانا
اپنے ہی ہم شکل جرثوموں کی پھیلائی ہوئی بیماریوں کے
ایکس رے فوٹو مرے الفاظ
غیر دنیا غیر اس کا تجربہ
لفظ غیر آہنگ غیر
پھر بھی میرے کان میں پھونکا کسی نے
جو بھی کچھ میں کر رہا ہوں
جو بھی کچھ میں لکھ رہا ہوں

بزدل

کہا، کون بزدل ہے؟
آواز آئی
وہی جو کھڑا ہے
شکستہ صداؤں کے انجان صحرا میں
ویران نغموں کی میت اٹھائے
وہی —— جو اداسی کی جلتی دوپہری میں
چنتا ہے پرواز کرتے ہوئے
کچھ پرندوں کے سائے
وہی —— جو سمجھتا ہے
اجداد کے فیصلوں کی امانت کو
اک حاملہ کی طرح وہ اٹھائے ہوئے ہے
وہی —— جو اندھیرے اُجالے
اسی وہم سے کھیلتا ہے
کہ ماضی کی سطوت کو

ماتھے پر اپنے سجائے ہوئے ہے
وہی ــــ جو جہالت کے پاتال میں
ہر گھڑی سوچتا ہے
کہ ــــ ہاتھوں میں تہذیب، عرفان اور آگہی کا
پھریرا اٹھائے ہوئے ہے

ــــــ وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو
علم اور معرفت کے خزانوں سے منہ موڑ کر
کبھی سوئے محراب دل دیکھتا ہے
کبھی سمت ہفت آسماں تک رہا ہے
کبھی اتنا غیظ و غضب ایسی وحشت
کہ سورج نگل لے، ستارے چبا لے
کبھی شام کے سائے میں حسرتوں کا
گزرتا ہوا کارواں تک رہا ہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو
خوف کے سائبانوں میں
جاں بازی کی جزائیں ڈھونڈتا ہے
محبت کی شاداب اور شبنمی وادیوں میں
جو کانٹوں بھری نفرتیں ڈھونڈتا ہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو

نسل، تہذیب اور خون کے زمزموں کو
عقیدوں کی تلوار سے کاٹتا ہے
رفاقت نے صدیوں میں
جس پیڑ کو چھاؤں دی ہے
اسے زنگ کھائی ہوئی دھار سے کاٹتا ہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے۔

maablib.org

زخمی پرندے

(۱)

نہ کوئی تیر چلا ہے
نہ کوئی سنگ گرا
نہ خون ہی کہیں ٹپکا
کسی کے بازو سے
سبھی کے سر ہیں سلامت
نہ کوئی زخم نہ گھاؤ
مگر یہ کیا ہے؟
کہ سب طائرانِ دشت وچمن
تڑپ رہے ہیں
سسکتے ہیں۔
زار وبسمل ہیں
سحر کی زرد شعاعیں
برہنہ شاخوں پر
انھیں نہ ڈھونڈ سکی ہیں
نہ ڈھونڈ پائیں گی

کوئی پہر
کوئی موسم ہو
کوئی عالم ہو
وہ اپنے کنجِ ملامت میں
قعرِ وحشت میں
جو کانپتے ہیں
تو بس پرہی پھڑپھڑاتے ہیں
گلوں کی فکر انھیں ہے
نہ آرزو
کہیں چل کے آشیاں ہی بنائیں
کہیں بسیرا کریں
مل کے کوئی جشن منائیں
نہ شوقِ نغمہ سرائی
نہ جرأتِ پرواز
وہ ایسے چُپ ہیں
سراسیمہ
سر بہ زانو ہیں
کہ جیسے اب کوئی بھونچال آنے والا ہے
رہِ سکوت سے طوفان آنے والا ہے
ابھی ہلیں گے یہ دیوار و در
یہ شاخ و شجر
فضا میں کانپ کے لہرا کے گر پڑیں گے ادھر
دہل اٹھے گی یہ دنیا

زمین شق ہو گی
چلیں گی آندھیاں ایسی
کہ — کوہ و دشت و چمن
اڑیں گے ابر کی مانند
اور پھر اس میں
مثالِ قفسِ آتش نوا
یہ طائر بھی
دہک اٹھیں گے
تو ایک روحِ آتشیں بن کر
زمیں تو کیا
کہ — فلک کو سنوار جائیں گے

یہ ایک خواب سہی
خواب دیکھنے والے
کبھی جو تھک گئے خوابوں سے
جاگ جائیں گے

مسودہ
(اپنی پہلی تصنیف کے لیے کوئی پبلشر نہ ملنے پر)

جانِ لوح و قلم، نازِ حسنِ بیاں
یہ لکیریں یہ الفاظ کا کارواں
حرف بکھرے ہوئے خطِ اوراق پر
روئے قرطاس پر زلفِ عنبر فشاں
جیسے عکسِ مژہ، رنگ رخسار پر
جیسے دستِ صفا پر حنا بندیاں
میرے عرفان کا کاغذی پیرہن
میرے افکار کا جرم لفظ و بیاں
میرے پندار کا شعلۂ آگہی
میرے وجدان کی شبنمی کہکشاں
یہ میرے جادۂ شوق کی منزلیں
یہ میرے دامنِ عشق کی دھجیاں

نیم شب کا فسوں صبح کی تازگی
ہر پہر کی ادا ہر گھڑی کا نشاں
کسمساہٹ کہیں ٹوٹتے جسم کی
اور کہیں چشمِ بے خواب کی سرخیاں

جون کی آتشیں دھوپ کی تابشیں
تیرتی ہیں کہیں ساونی بدلیاں
کچھ نمی میرے یخ بستہ دالان کی
کچھ مرے سرد کمرے کی بے مہریاں
کچھ یہ دھبے اُبلتی ہوئی چائے کے
کچھ سلگتی ہوئی سگرٹوں کا دھواں
اس میں تحلیل ہیں قلب کی دھڑکنیں
اس میں تحریر ہیں روح کی ہچکیاں

لے کے نکلا ہوں یہ دفترِ آگہی
ان کا بازار ہے میری جنسِ گراں
کس سے سودا کروں کس کو آواز دوں؟
کون ہے جو سُنے شوق کی داستاں
ہے کسے اس گھڑی فرصتِ یک نظر
وہ ہیں · اصنام ہیں اور فرشِ دُکان
بت گری بت فروشی حقیقت سہی
کچھ تو دیں قیمتِ خوابِ عمرِ رواں
کچھ تو تسکینِ قلب و نظر ہو سکے
کچھ تو گلرنگ ہو شیشۂ جسم و جاں
ان پہ نازاں سہی منصبِ آذری
میں نے دی ہے مگر پتھروں کو زباں

علی گڑھ ۱۹۵۹ء

موج و ماہی

ایک موجِ رواں۔ صفحۂ آب پر تیرتی
کسمساتی۔ لچکتی۔ تڑپتی ہوئی
سطحِ آب سے نیچے۔ تہ میں گئی
اک تھپیلے میں پڑی نیم خوابیدہ ماہی کو
آغوش میں لے کے اوپر چلی
راستہ میں عجب جوشِ پندار سے
موج گویا ہوئی
کم نظر۔ بے خبر ماہئ تہ نشیں
تو کنیزِ خور و خواب اب تک رہی
آ دکھاؤں تجھے زندگی۔ روشنی
رقص سورج کی کرنوں کا شام و سحر
شوخ چنچل ہواؤں کا اجلا نگر
مست شاخوں میں پتوں کی سرگوشیاں
مرغزاروں میں آہو کی مدہوشیاں
خوش نوا طائروں کے حسیں زمزمے
مست و محوِ سفر ابر کے قافلے

یہ وہ آزاد دنیا ہے
ذرہ جہاں قلبِ شہزاد ہے
ہر طرف پرفشاں
من کی آزادیاں، تن کی شہزادیاں

صفحۂ آب پر موج جونہی اٹھی
اک بڑی موج کے سیل آغوش میں
کھو کے گم ہو گئی
ماہیٔ کم نظر
سہمی سہمی ہوئی
دیر تک موج کی راہ تکتی رہی

maablib.org

کرشن موہن

بلیدان

کہتے ہیں پراچین سمے میں
بھارت دیش کے راجے اپنے دیوتاؤں کی مورتیوں کو
دوشیزاؤں کے گلرنگ لہو میں نہلاتے تھے
جوبن کی ہتیا سے ایشور پریم کی سوگندیں کھاتے تھے
سنگھ کے رسیا، انیائے کے پجاری
جیون کے بلیدان سے بھگتی کے جذبوں کو بہلاتے تھے
مجھ سے یہ بے رحمی کا بیوپار نہ دیکھا جاتا
مانگو جوبن پر یہ ایشور پریم' کا اتیاچار نہ دیکھا جاتا

آج بھی سندرتا پر ظلم ہے بھاری
پتھر ایشور کے پجاری
لوٹ رہے ہیں اس دھرتی کا جوبن
پھر بے رحمی کا بیوپار ہے جاری

'ایشور پریم' ——— یہ راجا اب پرجا کا جوبن لُوٹ رہا ہے
میں باغی ہوں ——— 'ایشور پریم' سے میرا رشتہ ٹوٹ رہا ہے
ایشور پریم ہے جوبن ہتیا، میں جوبن کا رسیا
ایشور پریم سے بڑھ کر ہے تُو نے جوبن کی لیلا
تیرے پجاری خون بہانے والے اتیاچاری نہیں ہیں
تیرے پجاری رسموں کے بیوپاری نہیں ہیں
اے جوبن کی لیلا۔

زہر خند

کبھی زندگی مجھ پہ ہنستی رہی، میرے خوابوں پہ ہنستی رہی، میری آہوں پہ ہنستی رہی ہے
گناہوں، مسرت کی اِن شاہراہوں پہ ہنستی رہی ہے گناہوں پہ جن کا المناک انجام
میں جانتا تھا

کبھی موت نے روزنِ غم سے جھانکا
میں ناچا کیا، لال انگاروں پر ایک اُمید کے آسرے پر میں ناچا کیا ہوں
میں ہنس ہنس کے ناچا کیا ہوں
مرے قہقہے کہہ رہے تھے
تری آرزوؤں کا آہستہ آہستہ خون ہو رہا ہے
ہنسی آ رہی تھی
مجھے بزمِ ماتم میں اپنی ہنسی پر ہنسی آ رہی تھی
میں ہنستا رہا، کھلکھلاتا رہا، اس چمکتے ہوئے چہرے سے قہقہوں سے، جو دل میں
نہیں تھا دکھاتا رہا اور دکھاتا رہوں گا

مری حسرتو، میرے خوابو
ہنسو اور اس زہر خندِ جنوں سے مری زندگی میں تلاطم مچا دو
سکوں پا رہا ہوں
تلاطم مچا دو۔

ولاس اور سنیاس

عجب ہوں میں بھی، غضب ہوں میں بھی
پچاس ہوں میں
ولاس کا پھر بھی داس ہوں میں
مگر کئی بار یوں ہوا ہے
کہ مجھ کو سنیاس مانگتا ہے
ولاس، سنیاس کی یہ سیما
کہ جس پہ میں دیر سے کھڑا ہوں
مری نظر میں سما رہی ہے
شریر اور آتما کو درپن دکھا رہی ہے
کبھی یہ جی چاہتا ہے میں جنسیت کے طوفاں میں ڈوب جاؤں
شریر کی واسنا سے جینے کا لطف اٹھاؤں
مچل اٹھے 'کام' کی شرارت
کہ زیست ہے شدت و حرارت

کبھی یہ جی چاہتا ہے یہ بھوگ تج کے، چپ چاپ جوگ لے لوں

بنوں میں، جا کر رماؤں دُھونی
یہ آتما جو پڑی ہے سُونی
اِسے 'ہری نام' سے بساؤں
اور آتمک ہرش، یوگ آدرش سے یہ جیون سپھل بناؤں
عجیب سنگھرش میرے من میں مچل رہا ہے
دیارِ پیری کی سرحدوں میں شباب کا وہم پل رہا ہے
وِلاس، سنیاس کی یہ سرحد
کیے ہوئے ہے مجھے مقید
اُداس ہوں میں
پچاس ہوں، محوِ یاس ہوں میں

maablib.org

ٹھہرے، جی بہلائے

شاعر
قدم قدم پر
روپ دیکھ، مسکائے

پریتم
دیس دیس کے
البیلی شرمائے

رسیا
رنگ روپ کا
پیت کرے گھبرائے

ساقی
میخانے میں
سب سے آنکھ ملائے

آشا
انگ انگ میں
بل کھائے، لہرائے

طلسمِ نو

دُور سے مجھ کو صدائیں آئیں
سانپ بل کھانے لگے
اجنبی سائے مری آنکھوں میں لہرانے لگے

کبھی ماحول تھا پتھر کی لکیر
(رخِ رنگیں، لبِ احمر، گیسو
راحت دیدہ و دل)
میری محبوب تری آنکھوں میں کاجل کے خطوط
میری بے تاب تمناؤں کی خالق پلکیں.....
اِن لکیروں کا فقیر
دلِ ناداں تھا کبھی

ہو چلی شام، جنوں خیز جفاؤں کا زوال
دیکھو وہ کالے کلوٹے بادل

دیکھ بھوتوں کی چمکتی آنکھیں
جلترنگوں کی صداؤں کا طلسم

اب میرے گرد و نواح
ایک جالا سا تنا جاتا ہے
اک نیا عالمِ حیرت ہے محیط
مگر میں تاروں سے مانوس ہوا جاتا ہوں

maablib.org

کمار پاشی

سوگندھی

اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر
اک رستہ مرے پیچھے بھاگے
اک رستہ مرے آگے
بیچ میں چُپ چُپ کھڑی ہوں جیسے
بُوجھی ہوئی بُجھارت
کس کو دوش دوں، جانے بوجھ کر
کس نے کیا اکارت

آئینہ دیکھوں، بال سنواروں
لب پہ ہنسی سجاؤں
گلا سڑا ہی گزشت کہ جس پر
بیٹھی رنگ چڑھاؤں

جانے کتنی برف پگھل گئی
بہہ گیا کتنا پانی

کس ندیا میں ڈھونڈوں بچپن
کس دریا میں جوانی

رات آئے مری ہڈیاں جاگیں
دن جاگے میں سوؤں
اپنے اُجاڑ بدن سے لگ کر
کبھی ہنسوں، کبھی روؤں
ایک بھیانک سپنا: آگ میں لیٹی جلتی جاؤں
چولی میں اڑتے سکّوں کے سنگ پگھلتی جاؤں

اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر
اک رستہ مرے پیچھے بھاگے
اک رستہ مرے آگے
رستے بیچ میں کھڑی اکیلی
پیا نہ سنگ سہیلی
کیا جانے مجھ جنم جلی نے
کیا اپرادھ کیا ہے
آخر کیوں دنیا کا میں نے سارا زہر پیا ہے
ساری عمر نہ جانے اپنے بدن میں کیسے جیا ہے
میرے ساتھ زمانے!
تو نے اچھا نہیں کیا ہے

ڈور کھڑے مرے آنگن دوارے
پل پل پاس بلائیں
کہو ہواؤں سے اب، ان کو
دُور ــــ بہت ہی دُور کہیں لے جائیں

جھوٹ کی یہ کالی دیواریں
جھوٹ کا فرش اور چھت ہے
جھوٹ کا بستر، جھوٹ کے ساتھی
جھوٹ کی ہر سنگت ہے
جھوٹ بچھاؤں، جھوٹ لپیٹوں
جھوٹ اُتاروں، پہنوں
جھوٹ پہن کر جسم کے ویرانے میں دوڑتی جاؤں
سچ کے جگنو بول کہاں ہے
کب سے تجھے بلاؤں
اس لمبی تاریک سڑک پر کب تک چلتی جاؤں
کیوں نہیں ذہن کی دیواروں سے
ٹکراؤں، مر جاؤں

شمع سریکھی پگھل رہی ہوں
اوجھل کبھی اجاگر
اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر

مجھ سے ملنے کون آئے اب ان تنہا راہوں پر
بوٹی بوٹی بٹ گئی میری روشن چوراہوں پر
اس گہرے سناٹے میں کس کو آواز لگاؤں
کون آئے گا مدد کو میری
کیا چیخوں، چلاؤں
اپنے مُردہ گوشت کی چادر
اوڑھ کے چُپ سو جاؤں
اور اچانک نیندوں کی دلدل میں گم ہو جاؤں
کسی کے ہاتھ نہ آؤں
خود کو میں خود ڈھونڈنے نکلوں
لیکن کہیں نہ پاؤں

madlib.org

دلّی : ۲۵ جون ۷۵ء

پل ہی پل میں یہ سارا تماشا ہوا
شہر کے پانو میں سنسناتی ہوئی
ایک گولی لگی
اور وہ چکرا کے
دھرتی پہ اوندھا گرا
دیکھتے دیکھتے اس کے چاروں طرف
خون کا ایک تالاب سا بن گیا

جھاڑیوں سے ڈری سہمی چڑیاں اڑیں
اونچے اونچے درختوں کے
گنجان پتوں میں دبکے ہوئے
سب پرندے اُڑے
چیختے چیختے ــــــ
اور دہشت زدہ آسمانوں
کے صحراؤں میں کھو گئے

ایودھیا! میں آرہا ہوں

ایودھیا! آرہا ہوں میں
میں تیری کوکھ سے جنما
تری گودی کا پالا ہوں
تری صدیوں پُرانی سانولی مٹی میں کھیلا ہوں

مجھے معلوم ہے تو مجھ سے روٹھی ہے
مگر اب دور تجھ سے رہ نہیں سکتا
پرائے دیش میں گزری ہے جو مجھ پر
وہ خود سے بھی کبھی میں کہہ نہیں سکتا
ذرا سر تو اٹھا ــــ اور دیکھ
کتنی دور سے تجھ کو منانے آرہا ہوں میں
تجھے تیرے ہی کچھ قصے سنانے آرہا ہوں میں

ایودھیا! جانتا ہوں تیری مٹی میں اُداسی ہے
نہ جانے کتنی صدیوں سے
مری بھی روح پیاسی ہے

کہ ہم دونوں کی قسمت میں خوشی تو بس ذرا سی ہے
بہت دن ہو گئے ہیں مجھ کو تیرے آسماں دیکھے
سنہری دھوپ دیکھے چھم چھاتی کہکشاں دیکھے
تری گلیاں ترے بازار اور تیرے مکاں دیکھے
وہ دن جو تجھ میں روشن تھے وہ برسوں سے کہاں دیکھے
بچھڑ کر تجھ سے جو منظر بھی دیکھے رائیگاں دیکھے

مگر ہاں یاد آیا ——
ایک منظر اور بھی محفوظ ہے مجھ میں
حویلی ایک چھوٹی سی اور اس میں نیم کے سائے
کہ جس میں آج بھی زندہ ہیں شاید میری ماں جائے

اسی منظر کے پیچھے اور بھی دھندلے سے منظر ہیں
پرانی گم شدہ تہذیب کے گھر ہیں
جہاں خوابوں کی دنیا ہیں
جہاں یادوں کے دفتر ہیں
اندھیرے روبرو میرے
ستارے میرے اندر ہیں

کہیں رادھا، کہیں سیتا، کہیں بیاکل سی میرا ہے
کہیں پر کربلا ہے اور کہیں پر رام لیلا ہے
ترا میرا تو شاید ان گنت جنموں کا قصّہ ہے
کہ مجھ میں گو دور ——

ایودھیا! میرا باہر: کربلا ہے
اندروں میرا: کپل وستو ہے، مکّہ ہے مدینہ ہے
مجھے تیرے پُرانے اور روشن دن میں جینا ہے
بدن پر ہے ترا بخشا ہوا یہ کیسری بانا
ہے بھکشا پاتر ہاتھوں میں
سفر میرا ہے اب تاریک راتوں میں

ایودھیا! سر اُٹھا
اور دیکھ لے مجھ کو
تھکے قدموں سے اب تیری ہی جانب آ رہا ہوں میں
سفر تاریک ہے
پگ پگ پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں میں
مجھے آواز دے گھبرا رہا ہوں میں
تری خاطر جو برسوں سے چھپا رکھا ہے دل میں
وہ اُجالا لا رہا ہوں میں
ایودھیا!
آ رہا ہوں میں ——

جبر کی گہری دلدل میں ڈوبا رہے
چپ رہے

میری کمزور آواز سے دُور
• صدیوں پرے
کوئلے کی مہیب اور مُردار کانوں میں سڑتی ہوئی
بکھری لاشو اُٹھو
اور بتاؤ :
میں اب کس لیے چپ رہوں
کیا حراست میں ہوں

maablib.org

چاسنالہ — ۲

روشنی بھی نہیں ہے
ہوا بھی نہیں
کیا کسی نے، کسی سے کہا
یہ کسی نے، سنا بھی نہیں
کیا گزرتی ہے اک دوسرے پر
کوئی جانتا بھی نہیں
وہ جو اک بار تھک کر گرا
وہ اٹھا بھی نہیں
وہ جو گر کر اٹھا
دو قدم وہ چلا بھی نہیں

ایک دوجے سے ہم
ٹوٹ بھی اب چکے ہیں
جدا بھی نہیں
اپنی بے نور آنکھوں میں
خوابوں کا اندوختہ بھی نہیں

وہ جو اپنے سروں پر
تھا اک ضو فگن
وہ خدا بھی نہیں

جس قدر پاس ہیں
اُس قدر دُور ہیں
کتنے مجبور ہیں

ایسا لگتا ہے ہم
چاسنالہ کی کانوں میں محصور ــــــ بدبخت
مزدور ہیں

rekhta.org

کمال احمد صدیقی

بادبان

سمندروں کی نیلگوں فضاؤں میں بھی، رقص
کر چکا ہوں بارہا!
مرے لیے کوئی اُفق ـــ یہ آسماں کی وسعتیں بھی کچھ
نہیں
میں ان میں سیکڑوں ہزاروں زندگی کے گیت آتشیں
دُھنوں میں گا چکا!

کسی کو ڈھونڈھ ہی رہا تھا ـــ کون جانے کس کو ڈھونڈتا
تھا میں!
ہزار بار ڈھونڈتا رہا ہوں جس کو موسموں کے مدوجزر میں
مگر نہ پا سکا؟!
ستارے ڈوبنے لگے اور آندھیوں کی شدتیں حباب
بن کے رہ گئیں!
کسی کو ڈھونڈھ ہی رہا تھا میں سحر کی نرم نرم شبنمیں
فضاؤں میں

کہ آپ آگئیں، اور آ کے چھا گئیں سمندر اور آسماں
کی بے کراں خلاؤں میں
ہزاروں داستانیں بجرِ نیلگوں کی چشمِ ناز میں لیے ہوئے،
ہزاروں مہر و ماہ کی تجلیوں کا جسم آئینہ بنا ہوا ــــ !!

میں سوچ ہی رہا تھا، لہر ہی نبض کائنات تو نہیں،
کہ اک لہر اُٹھی جس کی برہمی کے سامنے مری تمام قوتیں
حباب بن کے رہ گئیں !
کنارِ آب ایک پل میں دیکھتے ہی دیکھتے میں چِر پڑا ہوا
تھا ریت پر
مرے بدن کی ریت کا ہر ایک ذرہ ایک گنگناتا، اور جانے
کتنے آفتاب جگمگا رہے تھے میرے جسم پر !

یہ میرا جسم خاک و خوں کا امتزاج ہی سہی،
ہزار میں گناہ گار ہوں تو کیا،
یہ زلزلے یہ آندھیاں یہ برق و آتش و شرر مرے مزاج ہی سہی،
مگر سکون پا کے جب بھی شادماں ہوا ہوں، گنگنا اٹھا ہوں مسکرا
دیا ہوں میں
مرے اس آہنی محل کے آستاں پہ آسماں کی جنتیں بھی سجدہ ریز
ہو گئیں !!
ــــــــ مگر بہت ہی دور آچکے ہیں ساحلوں کو چھوڑ کر !
اگر نہیں ہیں ناریل کے سائے سطحِ آب پر تو کیا ہوا !؟

ہوائیں تیز ہیں تو کیا؟ یہ لہریں شعلہ ریز ہیں تو کیا؟ اُٹھاؤ
لنگر اور بادبان کھول دو
میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، ایک کائنات اور بھی ہے
ماورائے کائنات!

برس رہا ہے امرت آسماں سے چاندنی کے روپ میں،
زمیں، زمیں کی کائنات کے لیے نمو ہے دھوپ میں،
مگر یہ برگ، یہ ثمر، یہ گلستاں بغیر رنگ کے تو کچھ نہیں!!
ستارے ڈوبنے لگے تو کیا؟ — یہ لہریں شعلہ ریز ہیں تو کیا
اُٹھو — اور اُٹھ کے کشتیوں کے بادبان کھول دو
یہ کون کہتا ہے کہ لہروں کا خدا کوئی نہیں؟
یہ لہریں خوب جانتی ہیں ساحلوں کا راستہ — !!

واپسی

یہ جھاڑیاں ـــــــ برہنہ جھاڑیاں کہ جن میں کلیاں، کونپلیں، نہ پتیاں
نہ پھول ہیں
سسک رہی ان پہ چاندنی تپاک وانہماک سے
یہ انہماک بھی عجیب ہے
کہ جیسے کوئی روتے روتے وجہ گریہ بھول جائے

زمین پر پڑی ہوئی خزاں رسیدہ پتیاں کسی حسین عہد کے خیال میں کچھ اس
طرح سے کھو گئیں،
کہ ان پہ کتنی اوس پڑ گئی ـــــــ کوئی خبر نہیں
یہ پتیاں، اور ان کا یہ سکوت بھی عجیب ہے!

نمو کا حوصلہ نہیں، کوئی پیام ہی نہیں ـــــــ کہ قطرہ ہائے شبنم آج ہیں
وہ اشک جو ستاروں سے نہ رک سکے
مگر یہ پتیوں کی بے حسی عجیب ہے

کہ ان میں کوئی جذبہ ـــــ کوئی لہر ہی نہ اُٹھ سکی

زمیں کا دل دھڑک رہا ہے آج بھی
یہ بات اور ہے کہ پتیاں ہیں بے خبر، یہ جھاڑیاں نہ سُن سکیں
مگر وہ ماہتاب جانتا ہے ـــــ یہ طلسم بھی عجیب ہے!

ارے یہ کیا ہوا؟
یہ پتیوں کا رقص ـــــ اور ہر ایک شاخ جھومنے لگی
نہیں! ـــــ یہ پتیاں تو دانت پیستی ہیں اور کانپتی ہیں ڈالیاں
یہ بر ہمی عجیب ہے
!

زمیں کو طعنے دے رہی ہے ہی خود اُسی کی کائنات!
زمین ـــــ تیری زندگی عجیب ہے
کہ تو ہر ایک طعنہ سُن رہی ہے، اور خموش ہے۔ کہ جیسے تو ہی کھوٹے تیرگی
دھوئیں کی ذمّہ دار ہے
یہ بے وقوف پتیاں، اور ان کی ہچکیوں کی یہ شکستگی عجیب ہے!

دھوئیں کو جذب کرے، فطرتِ زمیں کے یہ خلاف ہے
سحر تو ہو، شعاعِ مہر تازیانہ بن کے آئے تو ذرا
یہ کہرہ آسمان کی سمت بھاگ جائے گا
زمین، تیری زندگی عجیب ہے!

یہ پتیاں، اور ان کے طعنے گرد بن بھی جائیں گے

وہ گرد — جو زمیں کی زندگی کا ایک جزو ہے
یہ موت! زندگی نواز دل لگی عجیب ہے

تسلّی دے لی خود کو ماہتاب نے، اسی لیے تو چاندنی میں اس تبسمِ خیال
کی بھی ہے جھلک
ابھی ابھی تو چند لمحے پیشتر سسک رہی تھی، اور مسکرا رہی ہے اب!
یہ چاندنی عجیب ہے
ستارے کہہ رہے ہیں چاندنی کی مسکراہٹوں کو زیرِ خند — "یہ ہنسی
عجیب ہے"

مگر، سنو تو، ماہتاب کا ہے کیا خیال؟
نہیں! یہ راہبر نہیں، کسی بھی عہد کو یہ راہ کیا دکھائیں گے
زمیں کے دل کی دھڑکنوں سے بے نیاز رہبری عجیب ہے
انھیں تو اپنے ٹوٹنے کی بھی کوئی خبر نہیں

نسیمِ نو بہار تو کہاں؟ کہ جم گئیں ہوا کی تیغ سے ہڈیاں
برہنہ جھاڑیاں، گری ہوئی یہ پتیاں — یہ بیوگی عجیب ہے!
کہ آج بھی مری نظر میں پھوٹتی ہیں کونپلیں — وہ کھل رہے ہیں
پھول، اور جھاڑیوں پہ رقص کر رہا ہے
وہ حسین عہد، وہ سہاگ!

ستارے چشم ہائے کور ہیں، کہ جن میں دیکھنے کے نام پر ذرا بھی
روشنی نہیں

ہر ایک جاگتی ہوئی نگاہ ان کو دیکھتی ہے، ان کی روشنی عجیب ہے
مگر میں تجھ کو دیکھتا ہوں گو یہاں سے دور، تو بہت ہی دور ہے
یہاں تو تیرے سائے تک کا کوئی شائبہ، کوئی گمان ہی نہیں!

وہ کمرہ جس میں نیند کی کنواری پریاں، نذر خوب ہائے نو نگار و
نو شگفتہ شباب لے کے آئی تھیں کبھی
تری ہر ایک صبح آرزوئے نو کے واسطے مسرت شبینہ کا خیال
لائی تھیں کبھی
وہ خواب گاہ ناز! — تو اسی میں بند رو رہی ہے آج رات!
خروش ہچکیاں — یہ تیرا عالم خیال — بے خودی ہو یا خودی، عجیب ہے!

جہان بھر کے طعنے — اور تُو اکیلی! پھر بھی آنسوؤں سے فائدہ؟
یہ طعنے تو خزاں رسیدہ پتیاں ہیں، جن کی پائمال آرزوئیں
سرد تیرگی میں چیختی ہیں، بس جنھیں سوائے
چیخنے کے اور کام ہی نہیں
وہ پتیاں — ستاروں کے بھی آنسو جن پہ کچھ اثر نہ کر سکیں!
— تو آنسوؤں سے فائدہ؟ — ان آنسوؤں کو پونچھ ڈال
خزاں رسیدہ پتیوں کے واسطے یہ اذنِ خودکشی عجیب ہے!
یہ طعنے تیری زندگی کا جزو بن گئے تو کیا ہوا، کہ میں ابھی
مرا نہیں، میں اتنی دور سے بھی سن رہا ہوں تیرے
دل کی دھڑکنیں!

خیالِ ماہتاب — ٹھیک تھا کہ پھر جوان ہوں گی جھاڑیاں

الٹی میٹم

تمام انساں
حیات کو جن کی محنتوں نے وقار بخشا، دوام بخشا
عروسِ گیتی کی آرزو کو
جنھوں نے طرزِ کلام بخشا
حقیر و ناچیز خاک کو جن کی قوتوں نے مقام بخشا
جنھوں نے غلّے کی اور میووں کی فصل اگائی
جنھوں نے خود اپنے خون سے کی ہے نسلِ انساں کی آبیاری
جو کاٹتے ہیں جگر پہاڑ کے، تاکہ ہم کو
ہمارے چولھوں کو، موٹروں اور کارخانوں کو کوئلہ اور تیل
ملتا رہے ہمیشہ

جو کارخانوں میں رات دن کام کر رہے ہیں
ہماری آسودگی کی خاطر
اور اپنی محنت کو بیچتے ہیں
ہماری آسائشوں کی خاطر

یہ بات اور بے ستاروں نے سمجھ لیا تھا چاندنی کی مسکراہٹوں کو زہر خند
"تمہاری دوستی عجیب تھی!
مِری بے کسی' یہ بے بسی! یہ شاہکار زندگی عذاب ہے' وبال ہے
سہاگ بھی نہ دیکھ پائی اور بیوگی سے بھی خراب زندگی
تمہاری بے رُخی عجیب ہے!"

سمجھ رہے ہیں میرے دعاؤں کو فریب تیرے اشک؟
فریب کار' اور میں! ـــــ نہیں نہیں!!
میں آگیا ـــــ نظر اُٹھا کے دیکھ تو ـــــ میں آگیا!
میں آگیا!!
دھوئیں کی راہ میں کٹی ہوئی' سفر کی گرد میں اٹی ہوئی' یہ
زندگی عجیب ہے!

maablib.org

جو درس گاہوں میں علم کا درس دے رہے ہیں ہماری
آئندہ نسل کو تاکہ زندگی اور بھی حسیں ہو

وہ طالبانِ علوم، جن پر
ہے انحصارِ حیاتِ فردا
تمام عالم، اور اہلِ دانش
جنھیں محبت ہے زندگی سے
تمام سائنسداں، جو خیر و امن کی برکتوں کی خاطر
ہیں منہمک رات دن اسی دھن میں، کہ نسلِ انسان کے دوش پہ سے کسی
طرح محنتوں کا بارِ عظیم کم ہو
ہوا، سمندر، پہاڑ، دریا، برستے بادل، چمکتے سورج کی تیز کرنیں
ہر ایک موسم،
غرض کہ فطرت،
کسی طرح آدمی کو ہو اختیار ان پر،
کہ آدمی اس جہان کو، تیرہ خاکداں کو
سنوار دے اس طرح کہ جنت کے ہر تصور کو شرم آ جائے!

وہ پادری، مولوی، گرنتھی، پجاری، پنڈت، کہ جو
بجائے زر دار کی مشیت کے نوعِ انساں کو درس دیتے ہیں
راستی کا

وہ رہنمایانِ دیں، جنھوں نے
ضمیر اور نفس اہرمن کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے
جو مذہبی نہ بجائے انسان کی تذلیل کے حق میں ہیں اور پیار
پیار، الفت، اخوت اور دوستی کی

تبلیغ کر رہے ہیں

جو ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، اور شیطان کے بجائے
جو ساتھ دیتے ہیں آدمی کا!
وہ عورتیں جو کہ پچھلی جنگ عظیم میں اپنی عصمتوں کو
غنیم فوجوں کے ہاتھوں مجروح کر چکی ہیں
وہ عورتیں جو کہ پچھلی جنگ عظیم میں اپنی عصمتوں کو
بس ایک روٹی کے واسطے قتل کر چکی ہیں
وہ عورتیں جو کہ پچھلی جنگ عظیم کی نذر کر چکی ہیں
مسرت اپنی
سہاگ اپنا
وہ لوگ جو اپنے بھائی بہنوں کو، باپ ماں کو، جوان بچوں کو
ننھے بچوں کو، دل کے ٹکڑوں کو، زندگانی
کے آسروں کو
گزشتہ جنگ عظیم میں بھینٹ دے چکے ہیں
وہ لوگ جن کے حسین چہرے
لڑائیوں میں جھلس چکے ہیں
وہ لوگ، جو اپنے دست و بازو
گزشتہ جنگ عظیم کی نذر کر چکے ہیں
وہ لوگ جن کو، گزشتہ جنگ عظیم محروم کر چکی ہے
بھرے مکانوں، بجی دکانوں، لہکتے کھیتوں، مہکتے کھلیانوں
کے نظاروں کی دلکشی سے
تمام تاجر
جو جنگ بازار کو سمجھتے ہیں ایک لعنت

تمام انسان جن کو آزادیاں ہیں حاصل
تمام محکوم آدمی جو کہ اپنی آزادیوں کی خاطر
مصیبتوں کا شکار ہیں، پھر بھی لڑ رہے ہیں
وکیل اور جج
جنھوں نے اپنا ضمیر بیچا نہیں ہے اب تک
وہ ڈاکٹر، جو مریض کی جیب کے بجائے
مریض کا درد دیکھتے ہیں
تمام آزاد پیشہ انساں
تمام ملاح اور مچھیرے
تمام لوہار اور موچی
سنار، حلوائی اور بیرے
تمام بابو
تمام معمار اور رسالی
تمام بھشتی
تمام بھنگی
تمام دھنیئے
تمام کوری، تمام بھیے
تمام فنکار، ادیب، شاعر
جو دوسری جنگ کی گرانی میں پس رہے ہیں!
تمام انساں
جہان بھر کے تمام انساں
یہ جانتے ہیں کہ جنگ لعنت ہے ۔۔۔ ہزار لعنت کی ایک لعنت
عوام کے واسطے تباہی ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے، لیکن

ہے جنگ خوروں، اجارہ داروں کی، چور بازاری کرنے والوں
کی اک تجارت
اجل کے سوداگروں کا دھندا!

وہی ہیں جغرافیہ کی سمتیں، جو کل تلک تھیں
مگر جہاں تک ہے نسل اور رنگ کا تعلق
نہ کوئی مشرق ہے، اب نہ مغرب
تمام انسان ایک ہیں، اور اپنے دشمن کو جانتے ہیں
تمام انسان ایک آواز ہو کے اعلان کر رہے ہیں
ہمیں محبت ہے زندگی سے
ہم اپنی تاریخ کے خزانوں کے پاسباں ہیں
ہمارے ماضی کی یادگاریں
کہ جن کی بنیاد میں ہمارے عظیم اجداد کا لہو ہے
ہمیں گوارا نہیں ہے ہرگز
کہ کوئی شیطان ایک لمحے میں ان کو مسمار کر کے رکھ دے
کوئی بھی سازش ہمیں نہ گمراہ کر سکے گی
ہم آج تنبیہہ کر رہے ہیں:
ہر ایک قاتل،
ہر ایک ظالم،
ہر ایک جابر،
ہر ایک ڈاکو، ہر ایک رہزن
ہر ایک فرعون اور راون
ہر ایک چنگیز اور ہلاکو

ہر ایک تیمور اور نادر
ہر ایک ہٹلر، مسولینی اور ہر ایک توجو
ہر ایک چرچل، ہر ایک ٹرومن
یہ خوب اچھی طرح سے سن لے :
عوامِ عالم کبھی نہ بخشیں گے دشمنوں کو
جو ایٹمی جنگ کے گناہِ عظیم کی ابتدا کریں گے !

madblib.org

آفاق

افق سے تا بہ افق

(افق کہ جو مری نظروں کی سرحدوں میں ہیں
افق، جو آج بھی اوجھل مری نگاہ سے ہیں)
افق سے تا بہ افق زندگی دھڑکتی ہے!

زمیں سے تا بہ فلک

(فلک، کہ جن کے ستارے مری نگاہ میں ہیں
فلک، کہ میری بصارت سے بھی پرے جو ہیں،
فلک — کہ ایک حقیقت ہیں، پھر بھی جن کا وجود
مری نظر میں نہیں ہے، مرے شعور میں ہے!
فلک، کہ جن کے ستاروں کی روشنی میں نے
نظر سے دیکھی نہیں، پھر بھی جانتا ہوں میں
کہ ان میں کاہکشائیں مدام رقص میں ہیں!
میں ان کے رقص کے انداز سے نہیں واقف
مگر سنی تو ہے وہ آواز میرے کانوں نے

جو اُن کی برق کی پازیب سے نکلتی ہے)

زمیں سے تا بہ فلک، اور فلک سے تا بہ زمیں
نہیں ہے کوئی بھی شے، جو نہ ہو مرا موضوع!
حقیقتیں، کہ جو پہلے مری نگاہ میں تھیں
حقیقتیں، کہ جو کل اور آئندہ ہوں گی
حقیقتیں، کہ جو افشا کریں گی رازِ حیات
حقیقتیں، کہ جو آج ہیں آج بھی حیات کا راز
کچھ آشکار ہوئی ہیں، کچھ اور بھی ہوں گی!

مری نگاہ ازل سے بھٹک رہی ہے مگر
میں جانتا ہوں کہ آوارگیِ قلب و نظر
کوئی فریب نہیں ہے، کوئی فرار نہیں!

اُس ایک بات کی مجھ کو تلاش ہے، جس سے
ہر ایک رازِ زماں و مکاں کا کھل جائے
یہ آشکار ہو مجھ پر، یہ کائنات ہے کیا؟
یہ آشکار ہو مجھ پر، یہ کائنات ہے کیوں؟
حقیقتیں، کہ جو بکھری ہوئی ہیں ہر جانب
ہیں جزو ایک حقیقت کا اور وہ کیا ہے؟
ازل سے اس کا تعلق ہے کیا ابد کیا ہے؟

یہ بات بھی مجھے اب تک نہ ہو سکی معلوم

ازل بھی کوئی حقیقت ہے، یا کہ واہمہ ہے؟
ابد بھی کوئی حقیقت ہے، یا کہ واہمہ ہے؟
ابد — ازل ہی کا پرتو ہے، یا کہ خود بھی ہے؟
مکاں کے بعد کوئی لامکاں بھی ہے کہ نہیں؟
زماں، مکاں میں کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟
زماں، مکاں میں تعلق اگر ہے، وہ کیا ہے؟

یہ باتیں راز ہیں، یہ راز فاش ہونا ہیں
یہ راز جب بھی کھلیں، آج یہ حقیقت ہے
حیاتِ نو کے تقاضے بُلا رہے ہیں مجھے:
حیاتِ نو، کہ ہے جس کی تلاش مجھ کو بھی
حیاتِ نو، کہ جو خود بھی مری تلاش میں ہے!

maablib.org

وقت

وقت پھر وقت ہے، ٹکراؤں تو کیسے آخر
اسی ساغر میں ستارے بھی ہیں سیّارے بھی

یہی آغوشِ فنا ہے، یہی آغوشِ حیات
یہی دامانِ تجلّی یہی بحرِ ظلمات
اسی پردے میں ہیں روپوش وہ نظّارے بھی
جن کے پرتو سے عبارت ہے شعاعِ تخئیل
جس کی تابش سے فروزاں ہے متاعِ تخئیل
گل ونسریں کی بہاریں بھی ہیں انگارے بھی
اور یہ سیّارے یہ نظّارے یہ انگارے کمال
بجھ تو جاتے ہیں، مگر جیسے مسرّت میں خیال
بجھ تو جاتے ہیں، پر روپوش نہیں رہ سکتے
زندگی بھر تو فراموش نہیں رہ سکتے

یہ وہ لمحات پریشاں ہیں کہ جن کی خاطر
عرصہ ہائے اثرِ رنگ کے گہوارے بھی

اُس فضا میں ہیں معلق جیسے احساسِ جمال
کہا کرتا ہے، یہی وقت ہے، سیاروں کا جال
وقت صرف ایک ہے ماضی ہے نہ فردا ہے نہ حال
گردشیں لاکھ کریں عہدِ فنا کو ظاہر
وقت اگر ہے تو کوئی رنگ نہیں مر سکتا
کوئی ٹھکرایا ہوا سنگ نہیں مر سکتا!

وقت پھر وقت ہے، ٹھکراؤں تو کیسے آخر

maablib.org

کیلاش ماہر

وادیٔ گل سرسبز رہے گی

* سو سو غنچے!
رنگ و بو کا جال بنائے
گلشن گلشن
اپنے اپنے رنگ محل میں
جیون کے سنگیت میں جیسے کھوئے ہوئے ہیں!

کتنا بھیانک سپنا تھا!
گلشن گلشن
خون کی پتیاں، مہکیں اُڑتی ڈال ڈالی
کیاری کیاری موت کھڑی ہے!

خاک و خون میں لتھڑے غنچے
عزم و یقین کے دامن میں
خنداں، خنداں
جاگ رہے ہیں!
برف کا دیو!
شعلۂ گل تک آتے آتے اپنی آگ میں جل جائے گا
وادیٔ گل سرسبز رہے گی!

* "LET HUNDRED FLOWER BLOOM" MAO'S THESIS

"صدائیں آخرِ شب کی"

میرا ہمزاد مجھ سے پوچھتا ہے ۔۔۔
سرد سناٹوں کے موسم میں !
تمہارا نام کیا ہے ؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو ؟
تمہاری بدنمائی' روسیاہی کا سبب کیا ہے ؟
میرا ہمزاد مجھ سے پوچھتا ہے !

میں کہتا ہوں ۔۔۔ کہ میرا نام نانک سنگھ' وطن لاہور تھا
مگر اب تو جالندھر میرا مسکن ہے
میں کہتا ہوں ۔۔۔ کہ میرا نام "رام اوتار" ہے متھرا کا باسی تھا
مگر اب تو الہ آباد مسکن ہے !
میں کہتا ہوں ۔۔۔ مجھے نورِ الٰہی کے مقدس نام سے سب یاد کرتے ہیں
وطن اجمیر تھا پہلے ۔۔۔
مگر اب تو احمد آباد مسکن ہے !
یہ سب کذب و ریا ہے جھوٹ ہے' ہمزاد کہتا ہے
میرا ہمزاد مجھ سے پوچھتا ہے !
تمہارا نام نانک سنگھ ہے ۔۔۔ تو ؟

تمہارے نام سے کیوں گردوارے کانپ اُٹھتے ہیں
شبد ساکت ہوئے کب سے!

تمہارا نام رام اوتار ہے —— تو؟
تمہارے نام سے کیوں دیوتا پتھرا گئے سارے
گجر کیوں اب نہیں بجتے!

تمہارا نام ہے نورالٰہی —— تو؟
اذاں پانچوں پہر کیوں مسجدوں میں اب نہیں ہوتی
نمازی کیوں نہیں آتے؟

میرا ہمزاد مجھ کو گھورتا ہے خون آلودہ نگاہوں سے ——
تمہارا نام نانک سنگھ، رام اوتار یا نورالٰہی ہے!
تو پھر یہ آستینوں میں لہو آلودہ خنجر کس لیے ہیں...؟...؟
دہائی کیوں تمہارے نام کی دیتی ہیں یہ جلتی چتائیں
سرنگوں۔ سر پیٹتی مائیں!

تڑپ کر چیختا ہے —— مجھ سے پھر ہمزاد کہتا ہے
غلط ہے تم کہ نانک سنگھ، رام اوتار یا نورالٰہی ہو ——
مجھے تو ایک ہی چہرہ نظر آتا ہے ان ناموں کے پردے میں
"تمہیں نے گردواروں، مندروں اور مسجدوں کو ——
قتل گاہوں میں بدل ڈالا!
تمہیں نے نسلِ آدم کو خدا کے نام پر ایسے تشدد ریز خاتوں میں سمویا ہے

تمہاری روسیاہی، بدنمائی کا سبب یہ ہے ——
کہ تم ابلیس کے بیٹے ہو اور مغرب کے ساکن ہو
تمہارے خوں چکاں، اس مرگ آسا کھیل کی ——
یہ آخری شب ہے!

میرا ہمزاد کہتا ہے یہ چپکے سے
بھلا دو تم کہ نانک سنگھ، رام اوتار یا نورالٰہی ہو ——
گھونٹا توڑ دو اور صبح کی ——
آنکھوں میں اپنا نام پڑھ لو!
تمہارے مرگ آسا کھیل کی یہ آخری شب ہے

تخلیقِ نو

کہاں سے یہ میگھ دوت آئے!
فلک کی نیلاہٹوں کو پی کر ___ دھنک کی خوش رنگ پالکی میں
کہاں سے یہ میگھ دوت آئے
پیامِ تخلیقِ نو چھپائے!

سُلگتی راتوں کی جان لیوا گھٹن کے صدقے!
فسوں تو ٹوٹے گا تشنگی کا ___
نصیب جاگے گا ___ ریگ زاروں کی تیرگی کا

سنہری کھیتوں میں دلربائیں ___
نگاہیں جن کی بدلتے موسم کے ابر پاروں کو ڈھونڈتی ہیں
ہری بھری ڈالیوں میں، امرائیوں کی ___
گیت برہا کے گا رہی ہیں ___
حسین سپنے سجا رہی ہیں ___
کہاں سے یہ میگھ دوت لائے پیام ساجن کے لوٹنے کا

کہاں سے یہ میگھ دوت آئے؟

کہاں رہے میگھ دوت اب تک!
تمہاری راہوں میں دیو قامت پہاڑ تھے کیا؟
خلا کو مسمار کرنے والے بموں کے بازار راہ میں تھے؟
تمہاری راہوں میں کوئی "بیروت" بھی پڑا تھا؟
جوان لاشوں کا کوئی انبار بھی ملا تھا؟
کہاں رہے میگھ دوت اب تک؟
سلگتی دھرتی کے آنسوؤں کا تمہیں سندیسہ ملا تو ہوگا
پیام ناگفتنی ہے شاید!
سجل ہیں آنکھیں...؟

کہاں رہے میگھ دوت اب تک!
ہزاروں ندیاں
پرانے موسم کی کج ادائی سے سوختہ جاں
نئے تلاطم کی منتظر ہیں
کبھی تو مہا راج اِندر کی کم نگاہیوں سے
سبھی کو آتش پرستیوں کا صلہ ملے گا
ہر ایک صدف سے چمکتے موتی کا جنم ہوگا
کہاں سے یہ میگھ دوت آئے!

لمحہ لمحہ پیاس

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
کتابیں، قلم، میز، کرسی یہ البم
یہ گڈن کا معصوم فوٹو
ادھر شیلف کی گرد سے جھانکتی میر و غالب کی روحیں!
دھنک رنگ ماضی!
مری زندگی کا ایک ایک لمحہ
کوئی مجھ سے چھینے لیے جا رہا ہے
جہاں زندگی شعلۂ بے کراں ہے
ہر اک لمحہ اک لمحۂ جاوداں ہے
قلم ـــــ جیسے بوڑھا سپاہی تماشائے اہلِ ہنر دیکھتا ہو!

maablib.org

گوپال متل

نظم

تم نے دیکھا تھا اس کے چہرے کو
تھے کہیں کرب کے کوئی آثار
تم اسے موت کہہ رہے تھے مگر
خوابِ راحت میں وہ تو سوتا تھا

درپسماندگان کے سینے میں
جس جہنم کی آگ جلتی تھی
بجز خدا کون جان سکتا ہے

سخت حیرت ہے لوگ اس پر بھی
ماتمِ مرگ کر رہے ہیں مگر
ماتمِ زندگی نہیں کرتے

نظم

حقیر و ناتواں تنکا
ہوا کے دوش پر پرّاں
سمجھتا تھا کہ بحر و بر پہ میری حکمرانی ہے
مگر جھونکا ہوا کا ایک البیلا
تلوّن کیش
بے پروا
جب اس کے جی میں آئے رُخ پلٹ جائے
ہوا آخر ہوا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا تو بے وفا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا پلٹی
بلندی کا فسوں ٹوٹا
حقیر و ناتواں تنکا
پڑا ہے خاکِ پستی پر
خدا جانے کوئی رہ گیر بے پروا
جب اپنے پاؤں سے اس کو مسلتا ہے
تو اپنا خوابِ عظمت یاد کر کے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے

نظم

یہ سچ ہے ہم جسے مصلوب کرنے جا رہے ہیں
وہ نہ رہزن ہے نہ زانی ہے
مگر یہ جرم اس کا کم نہیں ہے، وہ ہمارے بد دیانت شہر میں
تلقین کرتا ہے دیانت کی

تمہیں معلوم ہے
ہم سب شریکِ جرم ہیں
ہم سب کے چہروں پر سیاہی ہے گناہوں کی
تو کیوں نہ سرخ رو ہو جائیں دھو کر اس کے خون سے
اپنے چہروں کی سیاہی کو

maablib.org

نظم

یوں اچانک ملاقات تجھ سے ہوئی
جیسے رہ گیر کو
بے طلب
بے دعا
راہ میں ایک انمول موتی ملے
اور ہنگامِ رخصت یہ احساس ہے
جیسے مردِ جفاکش کا اندوختہ
حاصلِ محنتِ زندگی
راہ زن چھین لے
جیسے زاہد کو پیری میں احساس ہو
عمر بھر کی ریاضت اکارت گئی

maablib.org

شب تاب

یہ برستا ہوا موسم، یہ شبِ تیرہ و تار
کسی مدھم سے ستارے کی ضیا بھی تو نہیں
اُف یہ ویرانیٔ ماحول، یہ ویرانیٔ دل

آسمانوں سے کبھی نور بھی برسا ہوگا
برقِ الہام بھی لہرا گئی ہو گی شاید
لیکن اب دیدۂ حسرت سے سوئے عرش نہ دیکھ
اب وہاں ایک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھ اس فرش کو جو ظلمتِ شب کے باوصف
روشنی سے ابھی محروم نہیں ہے شاید
اک نہ اک ذرہ یہاں اب بھی دہکتا ہوگا
کوئی جگنو کسی گوشے میں چمکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

کسی جاں باز کے ماتھے پہ شہادت کا جلال

کسی مجبور کے سینے میں بغاوت کی ترنگ
کسی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیر
قلبِ عشاق میں محبوب سے ملنے کی امنگ
دلِ زہاد میں ناکردہ گناہوں کی خلش
دل میں اک فاحشہ کے پہلی محبت کا خیال

کہیں احساس کا شعلہ ہی فروزاں ہوگا
کہیں افکار کی قندیل ہی روشن ہوگی
کوئی جگنو، کوئی ذرہ تو دہکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

گوپی ناتھ امن لکھنوی

رقابت

بگولوں کو اچھلتے آبشاروں سے رقابت ہے
خزاں کے دور کو اب نو بہاروں سے رقابت ہے
جو دردی کش رہے ہیں وہ بھی بیگانوں کی محفل ہیں
انھیں عہدِ ازل کے میگساروں سے رقابت ہے
جو کڑیاں جوڑتے رہتے تھے زنجیرِ غلامی کی
انھیں شانِ وطن کے پاسداروں سے رقابت ہے
بنا ہے جن کی تحریکوں کی مکر و زور و وحشت پر
انھیں الفت پرستوں حق شعاروں سے رقابت ہے
ہوا و حرص کے مارے ہوئے کچھ خامکاروں کو
جنونِ عاشقی کے پختہ کاروں سے رقابت ہے
فرومایہ حقیر و ہیچ بے رونق شراروں کو
عطارد مشتری جیسے ستاروں سے رقابت ہے
سوارانِ خرانِ لنگ کا یہ حوصلہ دیکھو
جو چابک دست ہیں ان شہسواروں سے رقابت ہے
تعفن خیز سوہانِ نظر نالے جو بہتے ہیں
انھیں گنگ و جمن کے تیز دھاروں سے رقابت ہے

مسلسل فریب

ہے منزل ایک دھوکا اور سفر بھی ایک دھوکا ہے
مناظر بھی ہیں دھوکے اور نظر بھی ایک دھوکا ہے
نہ جانے ربط ہے جذبات و احساسات میں کیا کیا
محبت اور محبت کا اثر بھی ایک دھوکا ہے

یہ جو انساں کی فطرت مائل عقدہ کشائی ہے
یہ جتنی کش مکش ہے جس میں قصد زور آزمائی ہے
ازل سے تا ابد جاری ہے عنوانات ہوں کچھ بھی
فریب ارتقا ہم رنگ شوق خود نمائی ہے

یہ جو نغمے کی کیفیت مجھے مسرور کرتی ہے
یہ جو اشعار کی خوبی مجھے مسحور کرتی ہے
مرے ہمسائے پر ان کا اثر ہوتا نہیں کچھ بھی
ہے میری خود فریبی جو مجھے مجبور کرتی ہے

طبائع مختلف ٹھیریں تو پھر معیار کیا ٹھیرا
نگاہیں اپنی اپنی جلوۂ دیدار کیا ٹھیرا
حوادث سے اگر افراد کی تعمیر ہوتی ہے
تو کیا ہے انفرادیت تو پھر پیندار کیا ٹھیرا

کوئی کہتا ہے پیہم کشمکش یہ زندگانی ہے
کوئی کہتا ہے باقی ہے کوئی کہتا ہے فانی ہے
مسلسل ایک چکر ہے کسی کا ہے یہ اندازہ
کوئی کہتا ہے بعد اس کے حیاتِ جاودانی ہے

خزاں کو کچھ نہ سمجھو فصلِ گل کی آرزو سمجھو
بہاروں میں گلستاں کو فریبِ رنگ و بو سمجھو
ہیں جتنے مسئلے سب خود فریبی کے مناظر ہیں
نظر میں ہو جو گہرائی فریبِ جستجو سمجھو

اگر یہ خود فریبی ہے فریبِ عیش ہی کھائیں
اگر دھوکے ہیں خار و گل تو دل پھولوں سے بہلائیں
حقیقت آشنا ہونا تو ہے کس کے مقدر میں
فریبِ رنگ و بو کے دور میں گلشن میں مرجائیں

جنگ

فضائے آسماں سے بے گنہ بندوں پہ بمباری
فنا کوشی کی خاطر نسلِ انسانی کی تیاری
یہ انسانوں کے اندر جذبۂ وحشت ارے توبہ
درندوں کی سی انسانوں کی یہ خصلت ارے توبہ
جہاں کل رنگ رلیاں تھیں وہاں ہے آج ویرانہ
زمانہ لکھ رہا ہے خون کے حرفوں میں افسانہ
بہانا خونِ انساں دورِ موجودہ کا اک فن ہے
تباہی ہاں تباہی مشرق و مغرب میں تقدغن ہے
وہی سائنس جس پر اہلِ یورپ ناز کرتے تھے
وہی تہذیب خوقِ مغربی دم جس کا بھرتے تھے
سراسر آج بے پردہ سراپا آج ننگی ہے
تمدن کیا ادب کیا سب فضا جنگی ہی جنگی ہے
اٹھا اے ہندی روایاتِ کہن کو تازہ تر کر دے
پیالہ پریم کا اُجڑی ہوئی محفل میں بھر کر دے
سنا پھر سازِ مشرق پر محبت کی وہی تانیں
کہ دنیا والے پھر ہندوستاں کی رہبری مانیں

محمد حسن

مفروضات

ایک لمحے کے لیے یہ فرض کرلو
کوئی دنیا میں نہیں
جو درد کا درماں بنے
جو مرا دکھ بانٹ لے
سارے انساں مر چکے ہیں
اک صدا آئی تھی جو ان سب کو پتھر کر گئی

ایک لمحے کے لیے یہ فرض کرلو
خونِ دل یاں رائیگاں ہے
آدمیت مٹ چکی ہے
زندگی اپنے پرائے سب کے دکھ سے بے خبر ہے
کھوپڑی بجتی ہے
اور ہر آدمی ایک دوسرے کا اجنبی ہے

اور اگر یہ ایک لمحہ
زندگی بن کر
ابد تک
پھیل جائے!

مرادآباد کے فسادات میں آبائی مکان جل جانے پر

اے ہوا کے آتشیں جھونکو، ذرا ٹھہرو
اس سلگتے ملبے سے آہستہ گزرو
اس میں
سوئی ہیں مرے بچپن کی یادیں
ہاں اسی ملبے کی تہہ میں
دفن ہے میری جوانی
اک ذرا ٹھہرو کہ میں اس شہر کو ایک بار پھر نظروں میں بھرلوں
جو کبھی میرا وطن تھا
اک ذرا ٹھہرو کہ اس سے آخری رخصت تو لے لوں
پھر کبھی اس شہر سے گزرے تو ہم بھی
اجنبی ہوں گے

چلو اے کارواں والو، چلو
کہ میں نے ذلتوں کی گرد، رسوائی کی ساری گندگی
دامن میں بھرلی اور اب اس کے سوا
یاں کیا دھرا ہے۔

پتھر پر نظم

دردسے تپتی ہوئی
سخت
پتھریلی زمیں پر
جب کہ رگ رگ سے اذیت کے نئے چشمے اُبلتے ہیں
زخم میں نشتر مچلتے ہیں
اور ہر حصہ بدن کا
پکّے پھوڑے کی طرح رہ رہ کر ٹپکتا ہے
نیم بے ہوشی کے عالم میں کوئی شانے ہلا ہلا کر پھر جگاتا ہے
جگمگاتا ہے!
کیا اسی کو نظم کہتے ہیں!!

maablib.org

ہم تم

ہمارے تعلم الفاظ کی دھول میں اَٹے ہیں
دماغوں پر خیالات کی دھند ہے
ہمارے بالوں پر گزرے ہوئے صدیوں کی برف پگھل پگھل کر گر رہی ہے
آنکھوں کی جھیلوں سے
روایات کی لوئی چھٹی ہوئی ہے
چہروں پر پرانی شکنوں نے جال سا بُن رکھا ہے

اور ہاتھ پاؤں
اپنی مرضی بھول چکے ہیں
آئینوں میں بوڑھے جھانک رہے ہیں
تمام ننگے جسم داغوں، تمغوں اور وردیوں نے ڈھانپ لیے ہیں
دل کی دھڑکن کی اجنبی چاپ
پت جھڑ کی سوکھی ٹہنی کی طرح ہمارے برآمدے میں چیخ رہی ہے

خدارا ایک لمحہ ہم کو دے دو
کہ اپنی زندگی جی بھر کے جی لیں

لکھنؤ

لکھنؤ

تیری سڑکوں پر وہ چلنے والے کدھر مڑ گئے
جن کے ہونٹوں پہ تھا پھول سا قہقہہ
جن کی باتوں میں تھا دوستی کا نشہ
جن کی سانسوں میں تھی گومتی کے کنارے کی سوندھی مہک

تو نے شاید انھیں در بدر کر دیا
اور ان کے لبادوں سے الفت، شرافت، کرم، دوستی اور
مروت کے سب لعل، سارے گہر
نوچ کر
زندگی کی جہنم کو لوٹا دیا

maablib.org

مخمور جالندھری

کم نگاہی

مڑ کے دیکھتا ہوں میں

زندگی کی رزم گاہ سرد اور بجھی ہوئی
جیسے ایک بیسوا رات کی تھکی ہوئی
ہو پلنگ پر اُداس، نیم جاں پڑی ہوئی
کوئی کشمکش نہیں، کوئی جستجو نہیں
اب تو دور دور تک حشر ہاؤ ہو نہیں
چار سو نگاہ میں ــــ سوکھے سوکھے جسم ہیں
موت کی جبیں پہ ہیں یا کریہہ تیوریاں
چار سو نگاہ میں ــــ ہڈیوں کے ڈھیر ہیں
آج بھی جھلکتے ہیں جن سے بھوک کے نشاں
زندگی گراں رہی موت رائیگاں گئی
سیر ہو کے جا رہے ہیں گدھوں کے کارواں
میرے ہمسفر تمام سادگی شعار تھے
رنج کے شکار تھے غم سے دل فگار تھے
پھر بھی مطمئن جئے ــــ کتنے وضعدار تھے
وہ پڑی ہے ناظمہ، وہ مری رفیقِ کار

وہ مری شریکِ غمِ زیست کی شگفتگی
بچ کر غم زدہ رہی افاقہ کش رہی مگر
بھیڑیوں کے واسطے، تر نوالہ ہی رہی
اس کا جسم ڈھانپ دوں کہ ہر برہنگی
اس فریب زار میں ناپسند کی گئی
حالتِ ستم نصیب دیکھتا نہیں کوئی
کیوں ہوا کوئی غریب دیکھتا نہیں کوئی
اور حقائقِ مہیب دیکھتا نہیں کوئی
باغ دیکھتے ہیں سب، راغ دیکھتے نہیں
چاند دیکھتے ہیں سب داغ دیکھتے نہیں

maablib.org

مگرمچھ کے آنسو

سُنتے ہیں۔ یادِ مصیبت میں خدا آتا ہے
آسرا اسکا بھی مجبور کی تقدیر میں رہ جاتا ہے

"کھول دو بند کلیساؤں کے در کھول بھی دو
مانا مانوس نہیں ہاتھ دعاؤں سے۔ دعائیں مانگیں
مملکت پر کہیں خورشید نہ ہو جائے غروب
حکم دے دو کہ سبھی اپنے خداؤں سے دعائیں مانگیں"

جی پہ بن جائے تو ذلت بھی اُٹھا لیتے ہیں
سُنتے ہیں۔ باپ مصیبت میں گدھے کو بھی بنا لیتے ہیں

"ناگ ہے اپنا معاون تو کوئی بات نہیں
کام لینا ہے ہمیں ناگ خزانے پہ بٹھا لو اپنے
شہد کا گھونٹ سمجھ کر ہم قاتل پی جاؤ
کسی قیمت کسی اجرت پہ اسے ساتھ ملا لو اپنے"

سارا دھن جاتا ہے تو نصف لُٹا دیتے ہیں
سنتے ہیں ۔۔۔ بچے جو چیخیں انھیں افیون کھلا دیتے ہیں

"سب کو بخشیں گے مصائب کی سلاسل سے نجات
جنگ لڑتے ہیں صداقت کی، مساوات کی اعلان کرو
اپنی من مانی ہی آخر میں کریں گے، اب تو
دہر کو وعدۂ پُر کیف سے منت کش احسان کرو
ناگ ڈستا ہے 'اسے دودھ پلاؤ کتنا
تُو کبھی بیری سے کبھی بیر نہیں جھڑتے، ہلاؤ کتنا"

"عہد آلام بھی معدوم، خدا بھی معدوم
کوئی خدشہ نہیں پھر سے ستم وجور کو ارزاں کرلو
فتح کا جشن منانا ہے مگر دھوم کے ساتھ
اپنے گھر حُسن سے، یا خون کی بوندوں سے چراغاں کرلو
اپنے محکوموں کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے
یہ تو وعدوں پہ بھی جی سکتے ہیں ان سے نئے پیماں کرلو"

تیرگی بڑھتی ہے طوفان امڈ آتا ہے
بدلیاں چھا کے برستی ہیں فلک پھر سے نکھر جاتا ہے

نیا مکاں

چلو مکاں کی مصیبت سے بھی نجات ملی
یہ خوابگہ، یہ کچن، غسل خانہ اور بیٹھک
میں سوچتا ہوں مجھے سوچنے کو بات ملی
ہوئی ہیں صرف مشقت کی کوششیں انتھک
نظر رُبا درو دیوار کے بنانے میں .....
یہ قمقمے ... یہ تمدّن کی اختراعِ جدید
بڑھی جلالتِ ادراک، تیرگی نہ مٹی
یہ سیڑھیاں ہیں نگاہوں کے پیچ کی مظہر
حیات کی کوئی پیچیدگی نہ دور ہوئی
مگر میں محو ہوں ادبار کے مٹانے میں
یہ سیڑھیاں ہیں جو ان پر سے گر پڑے کوئی
بُری گھڑی نہ خدا لائے جانے کب آجائے
یہ چکنا فرش اسے دیکھتا ہے کوئی
جو کل کو پاؤں تمہارا کہیں پھسل جائے
خدا کرم کرے ... میرا تو دم نکل جائے
میں سوچتا ہوں، مجھے سوچ کا جنوں جو ہوا
یہ میرے ذہن کا ماحول پُر فسوں جو ہوا!

(۲)

یہ میرا ذہن مجھے لے چلا ہے دُور کہیں
وہاں جہاں کبھی پہلے بھی تھا مکاں اپنا
فلک کے سائے میں ہم تھے کبھی پناہ گزیں
یہ فرشِ خاک تھا قالین زر فشاں اپنا
یہ مہر و ماہ، یہ تارے تھے اپنے گھر کے دیے
گل و گیاہ سے لبریز ——— پُر بہار زمیں
جلو میں حُسن لیے، دعوتِ نظر کے لیے
کبھی ہمارے لیے تھی نشست گاہِ حسیں
یہ زلف پیچ سے بیگانہ موجِ صہبا تھی
کہ جس کا برسوں مری انگلیاں رہیں شانا
یہ تیری ہمدمی اک کیفیت تھی، نشہ تھی
جہاں بھی چاہنا، فوراً وہیں چلے جانا
وہ صبح ساحلِ دریا . . . وہ شام زیرِ چنار
گزر گئی وہ مسرت کی صبح و شام اپنی
ہمارے دوش پہ جب تھا نہ جبر و قدر کا بار
چلو چلو یہ حکایت ہے تلخ کام اپنی
اُٹھو اُٹھو در و دیوار کو سجانا ہے
مکاں کو گہنوں لدی اک دلہن بنانا ہے

madlib.org

خیال آرہا ہے.....

خیال آرہا ہے.....
مری صبح — اندھے کنوئیں پر سے یونہی گزرتی ہوئی روشنی ہے
مری شام غاروں میں پھیلی ہوئی سنسناتی ہوئی تیرگی ہے
اگر صبح و شام اتنی بے کیف، پژمردہ رو ہو تو کیا زندگی ہے —

خیال آرہا ہے....
کہ اک دن جو سو کر اٹھوں عطر افشاں ہواؤں کی بوچھار پر چونک جاؤں
میں خود کو کسی مغربی شہر کے لطف افزا سمندر کے ساحل پہ پاؤں
جہاں کھیلتے ہوں، جہاں ناچتے ہوں گلابی گلابی بدن، شعلہ پیکر بگولے
ابھرتے ہوں اور ڈوبتے ہوں جہاں مرمریں، لالہ گوں، نیم عریاں ہیولے
جہاں چھاتا تانے ہوئے پیار دنیا کے آلام ٹھکرا رہا ہو
جہاں میز پر بوتلوں سے برستی ہو ساغر میں مردہ رگوں کی جوانی
جہاں لب سے ساغر چھوئیں اور بن جائیں آنکھوں کے ڈورے کہانی
اشارہ کروں میرے پہلو میں بھی کوئی آجائے ہنستا ہوا پھول اڑکر
اسے ساتھ لے کر اٹھوں تو بڑھے خیر مقدم کو میرے، مچلتا ہوا نیلگوں سرد پانی

ہر اک صبح یونہی جوانی سے میں کھیلتا کھیلتا دل کو سرشار رکھوں، جواں سال رکھوں ـــــــ

خیال آرہا ہے...
کہ آئینے کی طرح اک جھلملاتی ہوئی جگمگاتی سڑک ہو۔
میں بیٹھا ہوا "بس" میں مبہوت نظروں کو اونچے فلک بوس دلکش مکانوں پہ دوڑا رہا ہوں
میں انسان کے کھردرے ہاتھوں کے حُسنِ صنعت گری کے خیالوں میں کھویا ہوا جا رہا ہوں
کہ اتنے میں ترشے ہوئے بالوں والی کوئی نازنیں میرے پہلو سے اُٹھے
رُکے "بس" ـــــ سہارے سے بازو کے گرنے سے اُس کو بچا لوں
وہ ظالم تشکر کے اظہار پر مسکرا دے تو میں بھی یونہی مسکرا دوں
یہ میرا تبسم، وہ اس کا تبسم محبت کے رشتے کی بنیاد رکھ دے
یونہی باتیں کرتے ہوئے ہاتھ ڈالے ہوئے دونوں جا پہنچیں اک قہوہ خانے کی رنگیں فضا میں
جہاں کوئی کافر ادا اپنے کولھے ہلاتی ہوئی گا رہی ہو جوانی کے نشے میں ڈوبی نوا میں
مٹکتی ہوئی آنکھیں اور تھرتھراتا ہوا سینہ رگ رگ میں بھر دے امنڈتے ہوئے شوق کا تیز لاوا
گلابی کیے اپنی آنکھوں کے ڈورے شکم سیر ہو کر بہکتے ہوئے جھومتے جھومتے قہوہ خانے سے نکلیں
میں پہنچانے جاؤں اُسے گھر کے دروازے تک اور وہ مجھ سے لپٹ کر
وفورِ محبت سے گردن کے بانہوں کے حلقے میں لے کر حسیں ایڑیوں کو اٹھا کر لبوں سے لب اپنے ملا دے
ہر اک شام ہونٹوں کے رستے یونہی آبِ حیواں سے سیراب کرتا رہوں زندگی کو

خیال آرہا ہے...
کہ جب تک رسائی نہ ہو کیوں وہی شے بنا کرتی ہے تشنہ کاموں کے دل کی تمنا
جو پروانے کی آرزو شمع، بھوکے کی واحد تگ و دو نوالا
کسانوں کی امید پانی کی بوچھار اندھوں کی حسرت اُجالا
خیال آرہا ہے کہ منزل سے جو دُور ہیں ان کی حدِ نظر ان کی منزل ہے اس سے زیادہ کوئی ان کا مقصد نہیں ہے

خیال آرہا ہے جو قدموں میں منزل کا دامن لیے ہیں وہ کیا سوچتے ہیں
نہ جانے نہاں خانۂ دل میں ان کے جنوں کس تمنّا کا شور آفریں ہے
مجھے تو یہی اک لگن ہے
مری شام کب جلوہ ریز اور مری صبح کب رو کشِ خلد ہوگی

کبھی ہوں زمیں پر کبھی آسماں پر
یہ میرے خیالوں کو کیا ہو گیا ہے
قلابازیاں کھا رہے ہیں حقیقت سے دور اُڑ رہے ہیں
پلازہ میں کل مغربی فلم دیکھی تھی میں نے:

maablib.org

کندن

کندن ساٹھ برس کا بوڑھا چھوٹے قدم اٹھاتا ہے
صبح سویرے دھیرے دھیرے پُل پر بیٹھنے آتا ہے
دائیں بائیں — اس کی نگاہیں دوڑتی ہیں کچھ ڈھونڈتی ہیں
تیس برس پہلے کا زمانہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے
بیتے دنوں کا تصور — دل کے دکھ کو اور بڑھاتا ہے
دنیا اک دن اس کی تھی یہ دنیا آخر کس کی ہوئی
کندن — چلتے چلتے بیٹھے بیٹھے بھی تھک جاتا ہے
جیسے اسے قربِ منزل سے ڈر لگتا ہو خوف آتا ہو

کندن — دھیرے چلتا ہے اور تیزی سے گھبراتا ہے
بچوں کی چستی چالاکی پر اکثر جھنجھلاتا ہے
"ایک مصیبت — ایک قیامت" نئے زمانے کی اولاد
اگلے وقت کی عظمت اور شرافت کر ڈالی برباد"
اکثر اگلے وقت کی باتیں ہنس ہنس کے دہراتا ہے
اس کی کمر کا خم اکثر — اس موقع پر تن جاتا ہے
جب کوئی اسکول کو جاتی پھول سی شعلہ گوں لڑکی

دیکھتا ہے۔ بول اُٹھتا ہے یہ کیسا زمانہ آیا ہے
رنگ روپ کے بیچنے والی کا سا سوانگ رچایا ہے
اچھا ایشور تیری مرضی!! یہ بھی مصیبت سہنا تھی
شکر ہے اگلے وقتوں کی بیٹی کے ایسے ڈھنگ نہ تھے
لاج ہی اس کا جوبن تھی اور لاج ہی اس کا گہنا تھی"
لیکن دوشیزہ کے سراپا میں کندن کھو جاتا ہے

کندن صبح سویرے نہر کے پُل پر بیٹھنے آتا ہے
اکثر اگلے وقت کی باتیں ہنس ہنس کے دہراتا ہے
اس کی کمر کا خم اکثر ـــــ اس موقع پر تن جاتا ہے
کتنی خوش اسلوبی سے اپنی خفت کو چھپاتا ہے

مخمور سعیدی

ایک پرانا شہر

مہر بہ لب ویران دریچے، دروازے سنسان
دور پہاڑوں کی چوٹی پر شاہی گورستان
نیم کی شاخوں میں اُلجھی ہے کنکوے کی کانپ
دیواروں پر رینگ رہا ہے خستگی کا سانپ
سڑکیں راہگیروں پر ڈالیں ٹھنڈی سرد نگاہ
شرمِ عریانی سے چپ ہے بوڑھی شہر پناہ

وقت کے قدموں کی آہٹ دیتی ہے سُنائی ایسے
سناٹے میں بھٹک رہی ہوں بیتی صدیاں جیسے
اک اک لمحہ ڈھونڈ رہا ہے کھوئی ہوئی رعنائی
دوڑ رہا ہے پیچھے کو باوصفِ شکستہ پائی
راہ میں لیکن کچھ دیواریں آن کھڑی ہوئی ہیں
دیواریں جن پر ننگی سنگینیں گڑی ہوئی ہیں
ان سے سر ٹکراتے لمحوں کے یہ پگلے سائے
مملکتِ فردا کا رستہ کون انھیں دکھلائے

یادیں خوابوں کی دشمن ہیں

یادیں ــــــ
بھولے بسرے کل کی یادیں
اِک اِک گزرے پل کی یادیں
'آج' میں 'کل' کے رنگ کچھ اتنے گہرے بھر دیں
حال کو یکسر ماضی کر دیں
بیت چکا جو ــــــ اس کی جگ مگ دُھند میں کھو کر
رہ جائے 'موجود' اچانک 'غائب' ہو کر
آنکھ سے اوجھل اک اک منظر ــــــ
اپنی جھلک کچھ یوں دکھلائے
سامنے آنکھوں کے اب کیا ہے؟ نظر نہ آئے

یادیں ــــــ کل کی یادیں
اک اک پل کی یادیں
دیدہ و دل پر جادو جانے کیسا کر دیں
بھیڑ میں اکثر تنہا کر دیں

آج جو اپنے ہیں، ہو جائیں بیگانے سے
جانے پہچانے چہرے سب انجانے سے
زندہ حقائق افسانے سے!

یادیں ـــــ خوابوں کی دشمن ہیں
تازہ رشتوں کی الجھن ہیں
آنے والے کل کی جانب ـــــ
بڑھتے قدموں کو یوں روکیں
جیسے پرانے ملنے والے
دوست نیا تم کوئی بنانا چاہو تو ـــــ ٹوکیں

maablib.org

موسمِ بہار کی ایک نظم

پھر موسمِ نو بہار آیا
اک کیفِ نمو فضا پہ چھایا
سوئی ہوئی روحِ ارض جاگی
مُردہ ذرّات کسمسائے
مدفون سمن بروں کے پیکر
شاید تہِ خاک رسمسائے
بے جان زمین کے بدن میں
آثارِ حیات لوٹ آئے

سبزے کی نقاب رُخ پہ ڈالے
تیرہ زندانِ خاک سے یہ
کس نے باہر قدم نکالے!
لہروں پہ ہوا کی گامزن ہیں
رنگینی و روشنی کے ہالے

پیڑوں پہ شگفتگی کا عالم

اس دل کے بھی سارے داغ تازہ
یادوں کی تمازتیں سنبھالے
سایہ سایہ بھٹک رہا ہوں
ان برگ و گل و ثمر میں شاید
اسلم کہیں لہلہا رہا ہو!
شیما کہیں مسکرا رہی ہو!!
یا آصفہ تتلیاں پکڑنے
آئی ہو، کہیں مچل رہی ہو!!!

. شاعر کا مرحوم لڑکا (اسلم)، لڑکی (شیما) اور بھتیجی (آصفہ)

maablib.org

دو چہرے

ترک و طلب کی راہ گزر میں
دو چہرے ہر وقت نظر میں
دونوں اک دوسرے سے ناخوش
دونوں باہم دگر خفا ہیں
پھر بھی اِس دلچسپ سفر میں
قدم قدم پر ______
موڑ اک ایسا آجاتا ہے
دونوں آپس میں گڈمڈ سے ہو جاتے ہیں
پل دو پل کو ______
آڑ میں اک دوجے کی جیسے کھو جاتے ہیں

اک ایسے ہی موڑ پر اب میں
______ رکا کھڑا ہوں
آڑ سے ایک دوجے کی نکل کر
الگ الگ اپنی اپنی پہچان جتا کر
دونوں، مجھ سے پوچھ رہے ہیں:

میں کس کا ہوں؟

ایک سے میرا ساتھ پُرانا
اور ایک میرا خواب سہانا
ایک سے میرے ماضی کا گہرا رشتہ ہے
ایک میرے مستقبل کو اپنا کہتا ہے
میں خود اپنے حال پہ حیراں حیران
خود سے پوچھ رہا ہوں:
میں کس کا ہوں؟
ماضی کا یا مستقبل کا؟!

madblib.org

اسلوب

لفظوں کا انبار تھا میرے چاروں جانب
طرح طرح کے لفظ تھے جن کی گنتی کوئی نہیں تھی
طرح طرح کی آوازیں
یہ لفظ ادا کرتے رہتے تھے
ہر آواز کو دوسری آوازوں سے جدا کرتے رہتے تھے
کچھ لہجوں کو خوش رکھتے تھے
کچھ کو خفا کرتے رہتے تھے

لفظوں کا انبار تھا میرے چاروں جانب
لوگ آتے تھے
طرح طرح کے لفظ اٹھا کر لے جاتے تھے
لوگ جو لفظوں کے بیوپاری کہلاتے تھے
طرح طرح کی آوازوں سے
اپنے اندر اور باہر کی خاموشی کو بہلاتے تھے
لفظوں کا انبار ہے میرے چاروں جانب
لیکن اس انبار سے میں نے
گنے چنے کچھ لفظ ہی پائے
جو میرے دل کی دھڑکن کو میری گنگ زبان تک لائے
میرا طرزِ سخن کہلائے

مظفر حنفی

لچھمن ریکھا

تم کہو گے دن تو میں بھی دن کہوں گا،
ہو بلا سے رات آدھی
میں کہوں گا رات،
تم سورج چمکتا ہو تو اس کو چاند سمجھو گے۔
تمہاری آنکھ میں آنسو نظر آئیں گے جب،
میں تعزیت کے ریشمی رومال سے پونچھوں گا ان کو۔
مسکراؤں میں،
تو تم اس کو گل افشانی کہو گے۔
اور دھوکے سے کہیں میں،
شب کو شب کہہ دوں،
کہیں تم دن کو دن کہہ کر مجھے سورج دکھا دو۔
نظر آئے اگر مجھ کو،
تمہاری آنکھ کے آنسو مگر مجھ کے سے آنسو،
مرے ہنسنے کے پیچھے جھانکتی محرومیاں تم کو نظر آجائیں،

تو سمجھو کہ ہم،
اک دوسرے کے جسم میں پوشیدہ شیطانوں سے
واقف ہو گئے ہیں۔

راونوں میں صلح جوئی کے لیے
بے حد ضروری چیز ہے،
لچھمن کی ریکھا۔

maablib.org

وصیّت

(شادعارفی کی موت پر اپنے بیٹے کے لیے)

گڈو بیٹے! روتے کیوں ہو؟
قصّہ سُننے کی خواہش ہے؟
اچھا اپنے آنسو پونچھو.
لو ہم اک قصّہ کہتے ہیں!

اسّی نوّے سال گزرتے ہیں،
افغانوں کی اک بستی میں لڈّن خاں نے جنم لیا تھا،
داروغہ کے بیٹے تھے وہ، نانا ان کے مولانا تھے،
کھاتا پیتا گھر تھا ان کا.
لڈّن خاں اچھے بچّے تھے (بالکل ویسے جیسے تم ہو)
ان کے گھر والے بھی ان سے اتنی ہی اُلفت کرتے تھے جتنی ہم تم سے کرتے ہیں.
جب وہ تھوڑے بڑے ہوئے تو،
نانا ان کو مکتب میں داخل کرآئے،
لڈّن خاں نے پڑھنا سیکھا،
لکھنا سیکھا، لڑنا سیکھا (آخر وہ افغانی بھی تھے)
چودہ پندرہ برسوں ہی میں لڈّن خاں کو یہ بے فکری راس نہ آئی
نانا اور ابّو دونوں نے لڈّن خاں سے کُٹّی کرلی،

(مرنا جینا تم کیا سمجھو)
تب مجبوراً
لڈن خاں نے پڑھنا چھوڑا،
اپنے گھر سے ناطہ جوڑا،
ٹیوشن کرتے۔ نشٹم پشٹم اپنے گھر کا خرچ چلاتے،
ان کی اماں کو راجہ سے تھوڑی سی پنشن ملتی تھی، کام کسی صورت چل جاتا
ماں نے ان کی شادی کر دی،
لیکن بیوی خوش قسمت تھی جس نے جلد ہی کٹی کر لی۔
گڈو بیٹے!
ہونی ہو کر ہی رہتی ہے
مکتب میں رہ کر لڈن خاں غزلیں کہنا سیکھ چکے تھے۔
افغانی ہونے کے ناطے لوگوں سے ڈرتے بھی کم تھے۔
اپنی غزلوں میں۔ نظموں میں تیکھی تیکھی باتیں کہتے، لوگوں پر پھبتی کستے تھے۔
(اپنے ہوں یا غیر سبھی پر)
سچ کہنے میں۔ سچ لکھنے میں باک نہ کرتے (یہ تو ایک نشہ ہوتا ہے)
بس پھر کیا تھا۔ اپنے غیر سبھی ان کے دشمن بن بیٹھے۔
ٹیوشن چھوٹے، دے مینی کی، دے مینی سے منشی گیری،
در در بھٹکے باز نہ آئے،
کڑوی تیکھی، غزلیں نظمیں، کہہ کہہ کر انبار لگایا،
اتنے سے بھی چل سکتا تھا۔
لیکن وہ تو راجہ جی پر پھبتی کس کر اماں کی پنشن لے ڈوبے
(بولو ان کی کیا اٹکی تھی۔ راجہ جو کچھ بھی کرتا تھا۔ لڈن خاں سے کیا مطلب تھا؟)
امی بے چاری اس غم میں کڑھ کڑھ کر پردیس سدھاریں (یوں سمجھو بس روٹھ گئیں وہ لڈن خاں سے)

لیکن بیٹا! مرنے میں پیسے لگتے ہیں۔ لڈن خاں نے گھر بھی بیچا۔
آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اب تو لڈن خاں کھل کھیلے
سچی سچی باتیں کہہ کر، کڑوی تیکھی غزلیں لکھ کر، زہر آلودہ نظمیں پڑھ کر
ایک سرے سے سب لوگوں کو دشمن در دشمن کر بیٹھے۔
ساری دنیا دشمن ہو تو لڈ خاں بچتے بھی کیسے
سب نے مل کر گھیرا ڈالا،
آگے دشمن پیچھے دشمن، دائیں دشمن بائیں دشمن اوپر دشمن نیچے دشمن . . .
لڈن خاں میں عقل نہیں تھی، اب بھی چکنی چپڑی باتیں کر کے چپکے سے بچ لیتے۔
لڈن خاں نے اپنی غزلیں، اپنی نظمیں، ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ کر،
چپکے سے مر جانے ہی کو بہتر جانا!

گڈو! میرے پیارے بیٹے!
میرے راج دلارے بیٹے!
دیکھو تم غزلیں مت کہنا!
بیٹے! تم نظمیں مت لکھنا!
لکھنا ہی پڑ جائے تو پھر سچ مت لکھنا!
دیکھو بیٹا!
سچ مت لکھنا!!
سچ مت لکھنا!!!

ابلاغ سے پرے

فضا میں ایستادہ روشنی کا ایک مینار
اسی کے پاس اندھیارے کی دیوار
ادھر وادی فنا کی
ہر طرف جس میں دھواں دھار
جیسے گھیرے ہیں کچھ رنگین بادل
شوخ، گل نار!
اس طرف خوشبو کی بوچھار
ذرا ہٹ کر سمندر علم کا
(جھاگوں کا انبار)
ادھر الجھن
نہ جانے کیا ہے اس پار؟

تم یہاں دبکے ہوئے ہو

میں خلاؤں میں پھرا،
پاتال میں بھٹکا،
سمندر چھان مارے
وسعتِ صحرا کو مٹھی میں لپیٹا
چاند سورج کھونڈ ڈالے،
اپنی گردن پر لیا تاروں کا خون،
وقت کی لاکھوں طنابیں کاٹ دیں،
آخرش،
تھک ہار کر،
(جب تم نہ مل پائے تو)
آ لیٹا ہوں،
اس اندھی گپھا میں
تم یہاں دبکے ہوئے ہو!

موت کا دوسرا نام

اس کو البم دکھاتے ہوئے
میں نے بتلایا
"یہ دیکھئے، یہ میرا دوست ہے،
آج کل غالباً کینیا میں،
ربر کی کسی فرم میں اونچے عہدے پہ ہے"
اس نے چہرے کو لمبا بنا کر کہا،
"میں اسے جانتا ہوں
کئی بار دو چار پیگ اس کے ہمراہ بھی پی چکا ہوں
یہ چھ سال پہلے مجھے کینیا میں ملا تھا
مگر اس ملاقات کے دوسرے ہی برس
ریل کے حادثے میں یہ مارا گیا تھا!"
فضا، دفعتاً درد سے بھر گئی۔
سمجھ میں نہ آتا تھا، میں اس کی ڈھارس بندھاؤں
کہ خود چند تسکین کے لفظ چاہوں۔
تو ایسا بھی ہوتا ہے...
یہ شخص جو میرے البم کے اس کالے پنے کے البم پہ بیٹھا ہوا مسکراتا ہے،
آج تک میرے نزدیک زندہ تھا یہ
اور میرے تئیں دو گھڑی پیشتر ہی مرا ہے
تو کیا موت کا دوسرا نام ہے آگہی!؟

من موہن تلخ

دکھ سے خالی خالی رونا

میں ہوں یا تم ہو
یہ سچ ہے
اپنے اندر ایک قبیلہ ہر کوئی ہے
جس کو شاید
رات کو صحرا کے رونے کا راز پتہ ہے
ایسا رونا
دور کہیں جیسے کچھ بچے
(صدیوں پہلے ہم نے جن کو قتل کیا ہو
اور وہ اپنے قتل سے پہلے)
روئے چلے جاتے ہوں
یا پھر
یہ ان روحوں کا رونا ہو
جو انسانی روپ میں ظاہر ہو نہ سکی ہوں
ریت کے ٹیلوں کو چھو چھو کر
مشکل، ہوا
روتی جاتی ہوں

اور۔۔۔!
قبیلے کے باشندے

ہم!
اپنے خیموں میں لیٹے
اپنے آپ سے باتیں کرتے
رات کو صحرا کی تنہائی کا رونا سنتے رہتے ہیں
سارنگی کی سُر کی طرح سسکتا صحرا

ہم سب میں سا ہے
لیکن پھر بھی
میرا رونا
تیرا رونا
دکھ سے خالی خالی کیوں ہے؟

maablib.org

جو خود میں تشکیل ہو رہا ہے

کبھی کبھی مجھ کو جان پڑتا ہے
جیسے مجھ میں
گھرا ہوا پربتوں سے
خالی سا اک محل ہو

جہاں کبھی
بدھ کے علم کا اک خزانہ تھا
جس جگہ
شلوک اور منتر ماحول میں
——— نہیں

خود مرے ہی اندر
مری صدا میں
ہمالیائی ہواؤں کی طرح گونجتے تھے
عجیب عظمت کے ساتھ میں یوں الگ تھلگ تھا
کہ جس طرح میری موت کی بات

قرنہا قرن سے ہے وہ راز
میں ہی بس جس کو جانتا ہوں
میں اپنے اندر رود آتا ہوں
جیسے کبھی
اک عظیم پیشین گوئی کا سیلِ بے سماعت
محل سمیت آسمان میں لے اُڑا تھا

یا پھر
میں اک تناؤ ہوں
آسمانوں کی سمت
بچپن کے حیرت انگیز خواب کے بے بنے محل سا
جہاں مرے چاروں سمت راہیں
(سفید ریت اور برف کی)

اپنی اپنی حد سے
مری طرف بڑھ رہی ہیں
جیسے
میں دیوتاؤں کا ہوں وہ مسکن
جو سب کو اپنی طرف بلاتا ہے اور
سب کی پہنچ سے کچھ اس طرح پرے ہے
کہ جیسے میں دیکھنے کی حد ہوں
میں ایک پربت ہوں
وادیاں جس نے بانٹ دی ہیں
میں اک گپھا ہوں
جو وادیوں کو ملا رہی ہے

میں جیسے صدیوں کی یاترا کی وہ گہری آواز ہوں جو اب تک
گپھا کے اندر سے آ رہی ہے
میں ایک بھکشو ہوں
جو کبھی کا
اسی گپھا میں سما چکا ہے
جو خود میں تشکیل ہو رہا تھا
جو خود میں تشکیل ہو رہا ہے

maablib.org

انجام

وہی چہرے نظر کے سامنے ہیں
جنھیں پہچاننا
مشکل نہیں ہے
یہ میرے سامنے برسوں رہے ہیں
مگر!
اب کس لیے!
یہ میرے سر میں
مسلسل درد سا رہنے لگا ہے
(انھیں ہر ایک پل تک تک کے شاید)
(مری آنکھیں ہی شاید بجھ رہی ہیں)
میں ان آنکھوں سے
اب کتنا دکھی ہوں
وہی چہرے
میں جن سے آشنا ہوں
مجھے آنکھوں پہ کتنا زور دے کر
انھیں پہچاننا پڑتا ہے
آخر!

یہ برقی روسی کیسے چھوڑتے ہیں
تھکن کی اور اکتاہٹ کی
آخر!
وہ باتیں ختم کیسے ہوگئی ہیں
وہ آوازیں!
کہاں ہیں آج؟
آخر!
وہ ان آنکھوں میں کیسے کھوگئی ہیں
کہ اندھے بھی
تو اک دوجے کو
آخر
بغیر آنکھوں ہی کے پہچانتے ہیں
تو کیا؟
آواز آنکھوں سے بڑی ہے؟
(یہ ہم پہ کیسی بپتا آپڑی ہے؟)
ہماری نسل!
کتنی زندہ دل تھی
ہماری نسل کا انجام
آخر!
ہوا ہے کس لیے اتنا بھیانک
کہ تک تک کر کسی کو اُوب جانا
نظر کے ساتھ خود بھی ڈوب جانا

بہانے ڈھونڈتا ہوں میں

بہانے ڈھونڈتا ہوں میں
کہ دفتر سے ذرا جلدی ہی اُٹھ جاؤں
(مجھے کیا دوستوں سے جا کے ملنا ہے؟)

نہیں!
اک دوسرے سے ہم سبھی تنگ آ کے بیٹھے ہیں
(مجھے کیا گھر پہنچنا ہے؟)

نہیں، ہرگز نہیں،
الٹا
بہانے ڈھونڈتا ہوں میں
کہ جتنا ہو سکے اتنا ہی میں گھر دیر سے پہنچوں
(مجھے حاصل نہیں کیا بیوی بچوں کی محبت؟)

ہے
مگر، پھر بھی نہ جانے کیوں
بہانے ڈھونڈتا ہوں میں
انھیں کچھ عرصہ کو میں بھیج دوں باہر
کہاں لیکن؟

نہیں معلوم کچھ مجھ کو
تو پھر کیا میری شاموں میں
تعلق کی ہنسی اور چاپ شامل ہے
نہیں تو،
پھر مجھے کیا کھائے جاتا ہے
کہ میں بندھ کر کہیں بھی رہ نہیں سکتا
بہانے ڈھونڈتا ہوں
توڑنے کو کون سا بندھن!

madlib.org

منورؔ لکھنوی

ابر و باراں

جامنی رنگ کا مشرق سے اٹھا ہے بادل — دیدۂ چرخ میں یا پھیل گیا ہے کاجل
مست ہاتھی چلے آتے ہیں یہ باندھے بادل — آبنوسی یہ بنا ہے کوئی گردوں پہ محل
مرغِ آبی کہیں کس طرح کہ بے پر ہے یہ
ایک اُڑتا ہوا پانی کا سمندر ہے یہ

کوہ سُرمے کا ہے یہ اوجِ ہوا پر کوئی — یا ہے بھیگے ہوئے کاغذ پہ سیاہی پھیلی
انجمن ایک یہ گویا ہے رواں بھونروں کی — یا ہے اک دیو صفت ریچھ کی تصویر بنی
اہلِ دنیا کی جہالت کا سویدا ہے یہ
یا کسی دیدۂ پُر آب کا چربا ہے یہ

کسی بدمست کے ہاتھوں سے یہ بکھری ہے مسی — یا لپکتی ہے یہ ناگن کوئی کالی کالی
آہ نکلی ہے دھواں بن کے کسی کے دل کی — کسی رنجور کے تن پر ہے یہ پوشاکِ غمی
بحرِ اسود سے یہ اک موج چلی آتی ہے
حبشیوں کی یہ کوئی فوج چلی آتی ہے

وسعت انگیز کسی کا ہے یہ قلبِ مایوس — ہے سیاہی میں رنگا پردۂ ننگ و ناموس
مائلِ رقص ہے پھیلا کے پروں کو طاؤس — چہ ظلمات ہے یا اوجِ فلک پر معکوس
کامنی بال یہ اپنے کوئی پھیلائے ہے
نازنیں اک دلِ مہجور کو الجھائے ہے

بجھ گیا ہو جو دھوئیں سے وہ غبارہ ہے یہ ۔۔۔ راکھ بن کر جو اُڑا ہو وہ شرارہ ہے یہ
مضطرب طشتری چرخ میں پارہ ہے یہ ۔۔۔ یا گنہگار کوئی محوِ کفارہ ہے یہ
صبح کاذب کا اسے آپ سپیدہ کہئے
یا سیہ فام اک آہوئے رمیدہ کہئے

لاکھ اظہارِ کمالات میں توڑا ہے قلم ۔۔۔ ان تشابیہ کے پردے میں ہے اک پہلوئے ذم
ابر ہے یہ نہ کسی حُور کی زُلفِ پُرخم ۔۔۔ ماتمی ہے نہ حکومت کا یہ شاہی پرچم
کرشن کی موہنی مورت کا مرقّع ہے یہ
سانولے شام کی صورت کا مرقّع ہے یہ

بال گوپال کی شوخی کی جھلک ہے اس میں ۔۔۔ کرشن کے حُسنِ دلآرا کا نمک ہے اس میں
خیرہ آنکھیں ہیں کچھ اس درجہ چمک ہے اس میں ۔۔۔ کہ نہاں تابشِ خورشیدِ فلک ہے اس میں
ایک اس ابر سے ٹھنڈک ہے ہزار آنکھوں میں
جلوہ گر ہو گئی دوا پر[1] کی بہار آنکھوں میں

---

[1] دواپر: ہندوؤں کی تقسیم زمانہ کے لحاظ سے ایک دورِ عظیم کا نام۔ جس میں بھگوان کرشن کا اوتار ہوا تھا باقی ادوار کے نام مشہور ہیں۔ یعنی ست جگ، ترتیا اور کلجگ۔

بجلی کی روشنی اور پروانہ

(ایک منظر دیکھ کر)

یہ عشق بے مزہ اے پروانہ کس لیے ہے؟
عقل و خرد سے اتنا بیگانہ کس لیے ہے؟

کیوں بے قرار ہو کر ناحق لپک رہا ہے؟
شیشے کے قمقمے پر کیوں سر پٹک رہا ہے؟

کیوں جوشِ عاشقی میں ہر شے سے بے خبر ہے؟
محفل نہیں یہ کوئی اک عام رہ گزر ہے

ناکام ہی رہے گا یہ اشتیاق تیرا
غافل! اڑا رہی ہے دنیا مذاق تیرا

اس رہ گزر میں تیرا ہمدم نہیں کوئی بھی
فریادِ بے زباں سے محرم نہیں کوئی بھی

ممکن نہیں کہ نکلے ارمان تیرے جی کا
کیوں خون کر رہا ہے ناموسِ عاشقی کا؟

شیشے کے قمقمے کو تو دیکھتا نہیں کیا؟
ذوقِ نظارہ تجھ میں باقی ذرا نہیں کیا؟

اس قمقمے کے اندر شعلہ سا ہے جو رقصاں
اس میں نہیں ذرا بھی اوصافِ شمعِ سوزاں

ہے اس کی روشنی کا کچھ اور ہی قرینہ
ہستی ہے اس کی دائم محتاجِ آبگینہ

اندر جو قمقمے کے پردہ نشیں نہ ہوتی
بجلی کی روشنی یہ ظاہر کہیں نہ ہوتی

سر پھوڑ کر یہ مانا پردے کو دور کر دے
شیشے کا قمقمہ یہ تو چور چور کر دے

بے پردگی کی حالت مانا کہ یہ ہوئی بھی
باقی نہیں رہے گی لیکن یہ روشنی بھی

پورا کبھی نہ ہوگا شوقِ وصال تیرا
تجھ کو ستا رہا ہے ناحق خیال تیرا

اندر بھی جا کے دامن ارماں کا چاک ہوگا
باہر سے بھی میسر تجھ کو نہ خاک ہوگا

ہے کچھ خبر تجھے دل کس کے لیے ملا ہے
اس کے لیے ملا ہے جس کے لیے ملا ہے

میں کیا ہوں؟

وہ مومن ہوں جو مرتا ہے نگاہِ کفر ساماں پر وہ منکر ہوں جو عاشق ہے جمالِ روحِ قرآں پر
وہ عاشق ہوں غذائے روح جس کو غم سے ملتی ہے وہ مجنوں ہوں بسر کرتا ہے جو ریگِ بیاباں پر
وہ میکش ہوں مئے کوثر گری ہے جس کی نظروں سے وہ زاہد ہوں نگہ رکھتا ہے جو صہبائے عرفاں پر
وہ ساغر ہوں جو پیہم گردشوں میں محو رہتا ہے وہ صہبا ہوں برستی ہے جو پیہم بزمِ رنداں پر
وہ قاتل ہوں خود اپنے قتل کا الزام جس پر ہے وہ بسمل ہوں تڑپ پیدا ہے جس میں خونِ ارماں پر
وہ کانٹا ہوں سبق دیتا ہے جو تکلیفِ صحرا کا وہ غنچہ ہوں تبسم ریز ہے جو رنگِ بستاں پر
وہ صحرا ہوں جسے گلہائے خنداں سے تعلق ہے وہ گلشن ہوں جو نکہت بار ہے خارِ مغیلاں پر
وہ دریا ہوں روانی ہے ازل سے خاصہ جس کا وہ ساحل ہوں جو چپ رہتا ہے اکثر شورِ طوفاں پر
وہ خرمن ہوں بڑھی ہے جس سے عظمت دانے دانے کی وہ بجلی ہوں جو صیقل کر رہی ہے ابرِ باراں پر
وہ کنعاں ہوں چھپا کر جس نے رکھا حسنِ یوسف کو! وہ یوسف ہوں جسے ہے ناز قیدِ چاہِ کنعاں پر
وہ مسجد ہوں جو کفر و شرک کی عظمت کا نقشہ ہے وہ مندر ہوں بِنا قائم ہے جس کی دین و ایماں پر
وہ اخگر ہوں جسے انکار ہے آتش فروزی سے وہ شعلہ ہوں تڑپتا ہے جو ذکرِ قلبِ سوزاں پر
وہ آنسو ہوں جو دامن سے گرا ہے اہلِ عصیاں کے وہ موتی ہوں کہ آب آئی ہے جس سے چشمِ گریاں پر
وہ رشتہ ہوں دلِ اہلِ جہاں ہیں منسلک جس میں وہ سوزن ہوں جو مائل ہے رفوئے چاکِ داماں پر
وہ مجرم ہوں کہ جس کو پابہ جولانی سے راحت ہے وہ قیدی ہوں گماں ہے اپنے گھر کا جس کو زنداں پر
وہ گیسو ہوں جو ہے الجھا ہوا خود پیچ میں اپنے وہ شانہ ہوں جو ڈورے ڈالتا ہے زلفِ جاناں پر

وہ عابد ہوں کلیسا جس کو ہر قلبِ مصفا ہے
وہ زائر ہوں چڑھاتا ہے جو نذریں کعبۂ جاں پر

وہ جادہ ہوں جو کر دیتا ہے ظاہر چور راہوں کو
وہ پردہ ہوں جو پڑ جاتا ہے اکثر چشمِ درباں پر

وہ رہرو ہوں جسے گم گشتگی خود اپنی رہبر ہے
وہ رستہ ہوں کہ جاتا ہے صراطِ بحرِ امکاں پر

وہ جوہر ہوں جو پنہاں ہے جگر میں سنگ ریزوں کے
وہ ہستی ہوں بنا جس کی ہے ذرات پریشاں پر

تصوّر یوں تو میں سب کچھ ہوں کہنے کے لیے ورنہ
وہ قصہ ہوں جگہ جس کو ملے گی طاقِ نسیاں پر

نریش کمار شاد

کاش

جب بھی تم آئے ظلمتِ شب میں
جسم کی چاندنی کو چھٹکائے
صبح سے تابناک چہرے پر
رات سے گیسوؤں کو بکھرائے
سوئی سوئی فضا کی لہروں میں
حُسن و مستی کی روح دوڑائے

دل میں آیا یہی کہ میرا وجود
کاش اب اک نگاہ بن جائے

maablib.org

اعتراف

میں نے خوابوں کے سمن رنگ شبستانوں میں
لوریاں دے کے غمِ دل کو سُلانا چاہا
تلخیٔ زیست سے بیزار و پریشاں ہو کر
تلخیٔ زیست کا احساس مٹانا چاہا

اور میں ڈرتے جھجکتے کسی مجرم کی طرح
آگیا تیری محبت کے پرستانوں میں
چھوڑ کر اپنے تعاقب میں نگاہیں اپنی
کھو گیا کاکل و رخسار کے افسانوں میں

میں نے سوچا تھا ترے جسم کی رعنائی سے
سنگدل ذہن کی تقدیر بدل جائے گی
زندگی وقت کے صحرا کی المناک سموم
تیرے انفاس کی مہکار میں ڈھل جائے گی

آہ اک لمحہ بھی لیکن مرے سینے کی تڑپ
تیرے گاتے ہوئے ماحول کو اپنا نہ سکی

تیری زلفوں کے گھنے اور خنک سائے میں
میرے جلتے ہوئے ادراک کو نیند آ نہ سکی

تیری ہنستی ہوئی گلریز چھلکتی آنکھیں
میری آنکھوں میں کبھی رنگِ طرب بھر نہ سکیں
تیرے دامن کی ہوائیں تھیں جنوں خیز مگر
میرے احساس کی قندیل کو گُل کر نہ سکیں

میں نے سوچا تھا مگر کتنا غلط سوچا تھا
زندگی ایک حقیقت تھی فسانہ تو نہ تھی
میری دنیا مرے خوابوں کی سنہری دنیا
نوحۂ غم تھی مسرت کا ترانہ تو نہ تھی

اب یہ سمجھا ہوں کہ اس درد بھری دنیا میں
میرے آغاز کا انجام یہی ہونا تھا
خواب بھر خواب تھے خوابوں کا بھروسہ کیا تھا
حاصلِ کاوشِ ناکام یہی ہونا تھا

ذہن پر لاکھ فسوں کارِ تخیل ہوں محیط
لاکھ پردوں میں نگاہوں کو چھپایا جائے
تلخیٔ زیست کا احساس نہیں مٹ سکتا
تلخیٔ زیست کو جب تک نہ مٹایا جائے

کناٹ پلیس

یہاں پہنچ کے تو ایسا گماں ہوتا ہے، کہ دُھل گیا ہے رُخِ زندگی سے گرد و غبار
فضا ہے کیف بداماں کسی دلہن کی طرح، قدم قدم پہ عجب بانکپن غضب کا نکھار

سیاہ رات میں ان خندہ ریز راہوں پر، مہک رہے ہیں پری چہرہ مہ وشوں کے بدن
کھنک رہے ہیں حسیں قہقہوں کے پیمانے، کھِلے ہوئے ہیں جواں مسکراہٹوں کے چمن

اور اس چمن میں ہم ایسے دکھائی دیتے ہیں، کہ سینۂ گل و لالہ کے داغ ہوں جیسے
دمکتے ہنستے ہوئے قمقموں کے جھرمٹ میں، بجھے بجھے سے فسردہ چراغ ہوں جیسے

نشاط و نور میں ڈوبی ہوئی یہ رعنائی، ہمیں نے سینچی ہے خونِ دل و جگر سے مگر
سیاہ کار تمدن کی چیرہ دستی سے، ترس رہے ہیں اسی کو ہمارے قلب و نظر

یہ رات نورِ سحر جس سے جھینپ جھینپ اُٹھے، جو سیم پوش دماغوں میں رنگ بھرتی ہے
ہماری تیرہ نصیبی کا آئینہ بن کر، غمِ حیات احساس تیز کرتی ہے

یہ لوگ آہ یہ لوگ اے مری رفیقِ حیات! گزر رہی ہے جو ہم پر کہاں سمجھتے ہیں
یہ مسکراتے ہوئے لب یہ شادماں چہرے، ہمیں بھی اپنی طرح شادماں سمجھتے ہیں

نو وارد

محترم خاتون مجھ کو دیکھتے ہی یک بیک
کیوں دہک اٹھی ہیں تیرے حُسن کی رعنائیاں
کس لیے تیرے رُخِ شاداب کی تنویر پر
چھا گئی ہیں جذبۂ تحقیر کی پرچھائیاں

میں انھیں اجداد کا فرزند ہوں جن کا لہو
جل رہا ہے تیرے گھر کے قمقموں کے روپ میں
سینچتے آئے جواب تک تیرا گلزارِ طرب
حادثاتِ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں

خوف کھا مجھ سے کہ اب میرے خیالوں کی لپک
توڑ سکتی ہے ترے خونی تمدن کے ستوں
گڑگڑاتا ہے جو تیری بے بصر نظروں سے دور
میں اسی طوفانِ ہیبت ناک کی اک لہر ہوں

اپنی آنکھوں میں لیے نفرت کا زہریلا غبار
دیکھتی کیا ہے مرے یہ چیتھڑے اے سیم پوش

سیم و زر کی چار دیواری سے باہر جا کے سُن
بھوک کی ماری ہوئی جانوں کا طوفانی خروش

دیکھ ابھر کر اپنے کجلائے ہوئے ماحول سے
میرے جیسے ان گنت محنت کشوں کے کارواں
زرد چہروں پہ دہکتے عزم کی رخشندگی
خشک آنکھوں میں بغاوت کی لپکتی بجلیاں

وسعتِ کون و مکاں کی تلملاتی روح میں
گونجتے ہیں انقلابِ نو کی شہنائی کے راگ
پھوٹنے کو ہیں بطونِ شب سے انوارِ سحر
محترم خاتون اپنے عنبریں خوابوں سے جاگ

اب زیادہ دیر تک انساں کی عظمت کا جمال
لُٹ نہیں سکتا حصارِ نخوت و جبروت میں
آقا و بندہ کا یہ بیمار و کہنہ امتیاز
سڑ کے سج جانے کو ہے تاریخ کے تابوت میں

یہ حقارت جس کو پالا ہے تری تہذیب نے
وقت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہ جائے گی
قہقہے ماریں گے صدیوں کے فسردہ ولولے
تیری آبائی رعونت دیکھتی رہ جائے گی

دو آوازیں

پہلی آواز

مانتا ہوں دل نشیں اشعار کہہ سکتا ہے تو
تیری فکرِ عنبریں ہے اک جہانِ رنگ و بو
تیرے کیف انگیز نغموں سے فضا مسحور ہے
اور دنیائے ادب میں تو بہت مشہور ہے
دل نشیں اشعار لیکن پیٹ بھر سکتے نہیں
بے نیازِ تلخیٔ حالات کر سکتے نہیں
زندہ رہنے کے لیے نان و نمک درکار ہے
زندگی نغمہ نہیں تانبے کی اک جھنکار ہے
اس لیے اس شاعرانہ بانکپن کو چھوڑ دے
زندگی میں مصلحت سے کام لینا سیکھ لے
افسروں کی چاپلوسی کو بنا اپنا شعار
چاپلوسی پر ہے دنیاوی ترقی کا مدار
دفن کر دے فائلوں میں نازک احساسات کو
اور پلّے باندھ لے اے بے خبر اس بات کو

شاعری ہے ایک ایسی تند خو سی نازنیں
جو رقیب اپنا کبھی برداشت کر سکتی نہیں
شعر کہنے کے مرض میں ہوگیا جو مبتلا
شعر کہنے کے سوا ہر کام سے جاتا رہا
شاعری دیوانگی ہے چھوڑ یہ دیوانہ پن
تجھ کو رہنا ہے اگر دنیا میں دنیا دار بن
شاعری تیرے وطن میں مستقل آزار ہے
نوکری کی فکر کر فکرِ سخن بے کار ہے
بھول جا اے شاد اپنی شاعری کو بھول جا
کر کلرکی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا

دوسری آواز:

مانتا ہوں ظلمتِ ماحول میں ہے تو اسیر
کم نظر ہیں پھر بھی جو تجھ کو سمجھتے ہیں حقیر
تیرگی میں بھی تری فکر و نظر دیتی ہے لَو
تیرے احساسات میں ہے نوبتو صبحوں کی ضو
جبرِ ہستی کر نہیں سکتا تری ہمت کو پست
تیری خودداری کو دنیا دے نہیں سکتی شکست
تیری فطرت میں ہے شامل رنج و غم سے کھیلنا
مسکرا کر زندگی کی سختیوں کو جھیلنا
تپ کے آفاتِ جہاں کی دھوپ میں اے جانِ من
اور بھی نکھرے گا تیری شاعری کا بانکپن
مصلحت کے در پہ جھک سکتی نہیں تیری جبیں
تو زمانہ ساز بن جائے یہ ممکن ہی نہیں

تیرا احساسِ تپاں بے سوز ہو سکتا نہیں
جاگ کر تیرا شعور شعر سو سکتا نہیں

تیری شریانوں میں ہے ہر ابنِ آدم کا لہو
جب کوئی بھی زخم کھائے گا تڑپ اُٹھے گا تو

ٹھیک ہے یہ دورِ سیم و زر کا اک بازار ہے
اور اس بازار میں جنسِ سخن بے کار ہے

زندگی اس دور کی لیکن ہے بالکل مختصر
چند دن تک اور ہے ناقدریٔ اہلِ ہنر

یہ معاشی الجھنیں دو چار دن کی بات ہیں
کل تو ہو سکتے نہیں ہیں آج جو حالات ہیں

فکر کیا اس دور کے جاں کاہ ظلم و جور کی
شادؔ تو ہے اک امانت آنے والے دور کی

نیاز حیدر

شہر ہوگا نہ بیاباں ہوگا

کرۂ ارض پہ مسموم ہواؤں کے سوا
خاک و خونِ دلِ آدم کی گھٹاؤں کے سوا
کوئی مفتوح نہ فاتح
کوئی بندہ نہ خدا
کوئی آزاد نہ محکوم
نہ اچھا نہ بُرا
بے نشاں! عالمِ ہُو!
عرصہ گہہِ جہدِ بقا
اس تصور سے
اسی خطرۂ ناوقت کی دہشت سے پھر
واسطہ دل کی دھڑکتی ہوئی تقدیر کو ہے
وقت سے تیز قدم
جذبۂ تعمیر کو ہے
آتشِ خونِ شہیداں سے یہ روشن مشرق
اک نئے دور کے سورج کا تمنائی ہے

ہم جسے دورِ حیاتِ ابدی کہتے ہیں
اور ارمانِ حیاتِ ابدی کی آواز
ماہ و انجم کی فضاؤں میں ہے جو نغمہ طراز
اسی گاتی ہوئی آواز کی دہشت ہی سے ہے
جنگ زادوں کی صفوں میں انتشار
جاگ اٹھا ہے عزازیل کا شور
امن کی آواز
اور عزمِ دلِ انساں کی یہ سرزمیں
راکھ ہو جانے کو ہے
آج یہ لمحہ بھیانک ہے بہت
جیسے خاکسترِ پروانہ پر — تاریک رات
اور اسی خطرۂ ناوقت سے پھر
واسطہ
دل کی دھڑکتی ہوئی تقدیر کو ہے
وقت سے تیز قدم جذبۂ تعمیر کو ہے
زندگی بھی ہے یہی لمحہ یہی موت بھی ہے
امن کی فتح نہ ہوگی تو قیامت ہوگی
شہر ہوگا
نہ بیاباں ہوگا!

گگارِن

وہ دل کہ جس پہ فدا کیف و کم کی ہر خواہش
تجلّیوں کا تموّج تمازت و تابش
تری زقند سے ٹوٹا طلسمِ نقل و کشش
کہ تکتے رہ گئے سب اہلِ دیدہ و دانش

خلا کو وزن کا احساس تیرے دم سے ہوا
کہ بے کراں سفر آساں تیرے قدم سے ہوا

تری نگاہ کے تابع نظامِ کون و مکاں
یہ کائنات خیال و قیاس و وہم و گماں
نثارِ جنبشِ مژگاں ہزار کاہکشاں
جمال ارضِ حیات آفریں اجل ساماں

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہے حسنِ دوعالم کو
شرف کبھی نہ ملا تھا یہ چشمِ آدم کو

اور یہ سفر ختم نہ ہوگا

بڑی دور سے اپنے تک پہنچا ہوں
پہاڑ کی اونچائی
پتھریلی راہیں
مٹی کے تودے
دھرتی پر ذروں کی بنی ہوئی گھاٹیاں
برفیلی وادیوں کی ٹھنڈک
سمندروں کے مگرمچھ،
زمین کے اجگروں،
اچھلتے چوپایوں کے اوتاروں کا
روپ دھار کر
پار کیے ہیں میں نے ریگستان اور ساگر
بادل، دریا،
اور آنسوؤں کی برکھا سے
امیدوں کے ہر پودے کو سینچا ہے
نباتات اور جمادات
ہوا کے جھونکوں سے

حرکت اور رفتار کی لہروں سے

صدیوں بعد
ملا ہے یہ انسانی جسم
دماغ و قلب و نظر سے لیس
بدن۔
گھور اندھیروں اور بھیانک تب وتاب سے
گزرا ہوں میں
بڑی دور سے اپنے تک پہنچا ہوں میں

اور اب
یہ سوچ رہا ہوں
سندر و آبادورن
حسیں ماحول
درخشاں چہرے
کب تک مجھ کو دکھائی دیں گے
رہیں گے کب تک نظر نواز ؟
فطرت کے دلکش نظارے
کب تک ان کی کھوج ــــــ کہاں تک بھٹکتی کرتا رہوں گا میں
کتنے گیت، بھجن اور کتنی غزلیں
جن کا انت نہیں ہے ــــــ کوئی
ہے قانون یہی فطرت کا
جوان جسم ڈھل جائے گا اک دن
عقل جواں ہو جائے گی
حسن بدن کا اک حسیں کردار بنے گا

روپ رنگ،
سب کچھ۔ سب کچھ بدلے گا

اک دن۔
عقل و فکر و خیال کی ہری بھری کیاری بھی
نذرِ خزاں ہو جائے گی
اور پھر اک دن

میرے جیسے
بڑی دور سے

اپنے تلک پہنچنے والے
انہی مناظر کو دیکھیں گے
ختم نہیں ہوں گے یہ حیرتناک مناظر اور نگاہیں
اسی نتیجے پر پہنچے گا ہر انساں
وہ بھی کہے گا، یہی بات جو کہتا ہوں میں
بڑی دور سے اپنے تک پہنچا ہوں میں

maablib.org

محویت

دل کے صحرا میں جانے کتنے قدموں کے نشاں
کون جانے کہہ رہے ہیں کس سے کس کی داستاں
عشقِ خاکستر میں باقی ہے دھواں احساس کا
چھوڑ جائے جس طرح جلتا الاؤ کارواں

جاگ جاگ اٹھتی ہے یوں سینے میں یادوں کی خلش
یاد آئے جس طرح رنگین بوڑھوں کو شباب
آگیا کچھ اس طرح مجھ کو خیالِ رفتگاں
جس طرح یاد آئیں شادی کے کسی بیوہ کو خواب

جس طرح خانہ بدوشوں کا ہو صحرا میں قیام
اس طرح ہیں کتنی یادیں میرے دل میں خیمہ زن
ہائے وہ جذبے مرے، جو تھے مجھے خود سے عزیز
ذہن کی پہنائیوں میں ہیں وہ لاشے بے کفن

جانے کتنے ہمسفر راہوں میں کٹ کر کھو گئے
جانے کس کس ہمسفر کی یاد میں رو رہا ہوں میں
رات بھر اُبھرا رہا تاروں کے دامن میں خیال
جانے کس وادی میں ڈوبا ہوں کہاں کھویا ہوں میں

سوچ

مری حیات کا انجام سوچنے والے
مری حیات تری سوچ کی نہیں محتاج

میں بے نیازِ غمِ زیست تو نہیں اے دوست
یہ اور بات مجھے زندگی ہی راس نہیں
بجا کہ آج نہیں کوئی میرا ہم آواز
بجا کہ آج زمانے کو میرا پاس نہیں

مری اداس نگاہوں میں جھانکنے والے
تری نظر سے تو پنہاں نہیں مرے حالات
یہ اور بات کہ تو بھی مجھے سمجھ نہ سکا
یہ اور بات کہ تشنہ رہے مرے جذبات

میں کائنات کو اپنا کبھی سمجھتا تھا
بہت عجیب تھا مری وفاؤں کا عالم
یہی وہ سادہ دلی ہے کہ آج تک جس کا
کیا بحال فسردہ نفس نفس ماتم

مرا خلوص مری زندگی کا سرمایہ
جہانِ فکر و نظر نے کچھ ایسے ٹھکرایا
مرے شعور نے تنہائیاں گوارا کیں
مری اَنا نے خلاؤں میں مجھ کو اپنایا

میں جانتا ہوں کہ مسلک ترا مروت ہے
یہی سمجھ کے تری بات سُن رہا ہوں آج
مری حیات کا انجام سوچنے والے
مری حیات تری سوچ کی نہیں محتاج

mpoblib.org

مفکّر

آج کچھ بھی ممکن ہے
میری ایک رائے پر
ہر کسی کی نظریں ہیں
آج میرے سائے پر
اک نظر نہیں لیکن
دل کی ہائے ہائے پر
چاہتا ہے جی کتنا
دل کی تھاہ پانے کو
یاس کام آتی ہے
اس میں ڈوب جانے کو
سوچتا ہوں دے جاؤں
کچھ نہ کچھ زمانے کو

لاکھ سر پٹکتا ہوں
خود سے خود الجھتا ہوں
سوچ کے شراروں سے
ذہن کو جھلستا ہوں
بجھتا ہوں نہ جلتا ہوں
رات دن سلگتا ہوں
یہ مری جنوں مندی
میرے کام آئے گی
دیکھ کر مجھے دنیا
مجھ سے سہم جائے گی
اور جنوں کی راہوں میں
مجھ کو چھوڑ جائے گی

گیت بن رہا ہوں میں
گیت سن رہا ہوں میں
فکر کے ہیولوں سے

ہر کسی سے کہتا ہوں
وقت کی بلندی سے
اسکو تو آجاؤ

جال بُن رہا ہوں میں
آپ اپنے گلشن سے
پھول چن رہا ہوں میں
اندھی بہری دنیا کو
کیا مجھے سُنانا ہے
خود کو پا کے کھویا ہے
خود کو کھو کے پاتا ہے
سُن سکے تو سُن دنیا
یہ مرا فسانہ ہے

دوستو مرے پیچھے
وقت تم سے آگے ہے
میں ہوں وقت سے آگے
فکر اور تجسس کے
یہ سوال رکھے ہیں
ایک ایک لمحے میں
ماہ و سال رکھے ہیں
ذہن کے پٹارے میں
ناگ پال رکھے ہیں

جو بھی کچھ گزرنی ہے
کب تک اس کو ٹالوں گا
اپنے آخری پل کو
جاوداں بنا لوں گا
موت سے گلے مل کر
زندگی کو پا لوں گا

کھوٹا سکّہ

میں نے خوب سمجھا ہے
میں نے خوب پرکھا ہے
گیت بک نہیں سکتا
پھر بھی گیت لکھا ہے

پھر بھی گیت لکھوں گا
اپنے فن کو پرکھوں گا
اور اس الاؤ میں
دل کا خون جلتا ہے

پھول سے مرے بچے
رات دن بلکتے ہیں
منھ سے کچھ نہیں کہتے
بھوک سے سسکتے ہیں

ہر کسی سے سنتا ہوں
ہر کوئی سناتا ہے
کھوٹا سکّہ بھی اکثر
کام آ ہی جاتا ہے

دل میں اک الاؤ سا
رات دن دہکتا ہے
یہ کہاں سمجھتی ہے
ایسی ذاتِ مستی ہے
روح دانے دانے کو
اب یہاں ترستی ہے
جس طرف نظر ڈالوں
یاسیت برستی ہے

منہ سے کچھ نہیں کہتے
پھول سے مرے بچے

مامتا بھری چھاتی
خون دے تو سکتی ہے
دودھ دے نہیں سکتی
بھوک ننھے بچوں کی
اور میں حزیں شاعر
قہقہوں میں روتا ہوں
شاعری کے آنچل میں
اپنے غم سموتا ہوں
انگلیاں خیالوں کی
خون میں ڈبوتا ہوں

کھوٹا سکہ چلتا ہے
گیت بک نہیں سکتا
بھوک مر نہیں سکتی
پیٹ بھر نہیں سکتا
ہر کوئی یہ کہتا ہے
ساز ہی تو خالی ہے
گیت تو نہیں خالی
پیٹ ہی تو بھوکا ہے
روح تو نہیں بھوکی

ماں کی خشک چھاتی سے
یوں چمٹ کے روتے ہیں
دودھ تو نہیں پاتے
خون پی کے سوتے ہیں

گیت بک نہیں سکتے
اور میں حزیں شاعر
گو کہ سب سمجھتا ہوں
پھر بھی گیت لکھتا ہوں

کاش کے مرے بچے
گیت سن کے سو جائیں
خواب کے جزیروں میں
مسکرا کے کھو جائیں

پھول سے مرے بچے
گیت سن کے سو جائیں
خواب کے جزیروں میں
مسکرا کے کھو جائیں

کاش وقت ٹل جائے
کھوٹا سکہ چل جائے

maoblib.org

اردو اکادمی دہلی

کی چند اہم مطبوعات

آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	مرتبہ: پروفیسر عنوان چشتی، قیمت: ۱۲۰ روپے، صفحات: ۳۸۴
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	مرتبہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، قیمت: ۸۵ روپے، صفحات: ۲۸۸
آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	مرتبہ: پروفیسر مظفر حنفی، قیمت: ۴۵ روپے، صفحات: ۲۵۹
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	مرتبہ: پروفیسر شارب ردولوی، قیمت: ۴۵ روپے، صفحات: ۳۶۰
آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	مرتب: پروفیسر شمیم حنفی، قیمت: ۶۰ روپے، صفحات: ۲۵۵
آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	مرتبہ: پروفیسر نصیر احمد خاں، قیمت: ۶۰ روپے، صفحات: ۳۱۹
آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	مرتب: پروفیسر قمر رئیس، قیمت: ۷۵ روپے، صفحات: ۳۲۴
ادب کا بدلتا منظرنامہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ	مرتبہ: گوپی چند نارنگ، قیمت: ۲۵۰ روپے، صفحات: ۵۴۴
دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	مصنف: پروفیسر محمد حسن، قیمت: ۱۲۰، صفحات: ۳۹۲
اردو مرثیہ	مرتبہ: ڈاکٹر شارب ردولوی، قیمت: ۱۳۰ روپے، صفحات: ۴۴۸

رابطہ: پی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی Ph : 23863858, Fax : 23863773

قیمت: [redacted] روپیہ